اکثر یاد آتے ہیں

مولانا عبدالعلی فاروقی

Luna Printing Press, Lko. # 9450357127

أحسن كما أحسن الله إليک

......اکثر یاد آتے ہیں—؟؟

وہ اکابر واعاظم، اعزا واقربا، اور وہ ہمسر وہم نوا، جنہوں نے جیتے جی اپنی الفت ومحبت کے ذریعہ دل پر حکمرانی کی، اور دنیا سے کوچ کرتے ہوئے اپنی یادوں کے چراغ روشن کرتے گئے۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
(حسرتؔ موہانی)

از قلم

مولانا عبد العلی فاروقی

(فاضل دیوبند- ایم، اے [اردو]، ایم-اے [عربی])

ناشر

مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ-۲۲۶۱۰۱

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKCNOW-226101 (INDIA)

Mob. No. 9450110463, 9839181475

اشاعت اول ۲۰۲۳ء

نام کتاب .... اکثر یاد آتے ہیں

نام مصنف .... مولانا عبد العلی فاروقی

(فاضل دیوبند، ایم-اے اردو، ایم-اے عربی)

E-mail:aafarooqi4@yahoo.com

Mobile No. 9415775044

کمپوزنگ .... عبد القدوس ندوی

صفحات ۲۰۰

تعداد .... چارسو (۴۰۰)

طباعت .... لونا پرنٹنگ پریس، لکھنؤ

قیمت .... ₹300/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ— ۲۲۶۱۰۱ (انڈیا)

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKCNOW-226101 (INDIA)

Mob. No. 9450110463, 9839181475

☆☆☆

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ

حکومت اترپردیش

کے

مالی تعاون سے شائع ہوئی

☆☆☆

کیا —— کہاں

☆☆☆

انتساب

امّی ـــــ آپ کے نام

اور یہ تو آپ کا حق تھا ـــــ کیوں کہ

چند برس قبل شائع ہونے والی میری کتاب ”میں نے بھی جنھیں دیکھا ہے“ کا انتساب

میری اور آپ کی مشترکہ **امّاں** (نانی صاحبہ مرحومہ) کے نام تھا۔

امی! آپ کا وجود تو ایک ایسی ڈور کا تھا، جس کے ٹوٹتے ہی ایک ایک کر کے بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے چہیتے آپ کے پاس پہنچنے کے لئے بے قرار سے نظر آرہے ہیں:-

پہلے آپ کے بڑے داماد **محمد عرفان عالم**۔ پھر آپ کے سب سے بڑے نواسے **عبدالمنان**۔ پھر ابھی چار ماہ قبل ہی آپ کے چہیتے داماد **حفیظ اللہ** اور اب آپ کو ماں بنانے والی آپ کی بڑی بیٹی **سمیہ** آپ کی آغوش محبت وشفقت میں پہنچ چکے ہیں ـــــ اور میں بھی اپنے رب کے فیصلہ کا منتظر ہوں۔

ابھی آپ کو ہم سے جدا ہوئے چھ برس کا عرصہ ہی تو ہوا ہے ـــــ مگر

کتنے ہونٹوں کی ہنسی ساتھ گئی ہے تیرے
موت بھی سوچ رہی ہے کہ یہ کون آیا ہے

آپ کا ناقدرا لیکن دلارا بیٹا

عبدالعلی فاروقی

۹ر دسمبر ۲۰۲۰ء

حرفِ چند

لکھنؤ شہر کے جس علاقہ میں میرا رہنا سہنا ہے وہاں کرفیو کا تو اتنی مرتبہ سامنا کرنا پڑا کہ اس کی ''عادت'' سی ہوگئی تھی ـــــ یہ الگ بات ہے کہ اس لعنت اور اس کے اسباب سے نجات پانے کی دعائیں اپنے رب سے کیا کرتا تھا۔ اور اپنے رحمان ورحیم رب کا کیوں کر شکر گذار ہوں کہ اس نے میری اور مجھ جیسے اپنے بہت سے دیگر بندوں کی دعاؤں کو شرف قبول سے نوازا، اور ایک طویل عرصہ سے ''باضابطہ واعلانیہ کرفیو'' کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔

لیکن بڑھاپے کی اس منزل میں کہ ''سٹھیانے'' کی حدوں سے بھی آگے بڑھ چکا ہوں ''لاک ڈاؤن'' جیسی بلا سے گذرنا پڑا، جس کا تجربہ تو کیا ہوتا، نام تک پہلی مرتبہ سنا تھا اور اول وہلہ میں سمجھ ہی میں نہیں آسکا تھا کہ اس میں کیا ہوگا اور کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا؟ ـــــ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس کے سبب ''کرونا'' کا نام پہلی مرتبہ سنا اور پڑھا تھا ـــــ میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کرپایا ہوں کہ ''کرونا'' اور اس سے بچاؤ کے لئے لگنے والے ''لاک ڈاؤن'' میں سے کون سا عذاب بڑا ثابت ہوا؟۔

''کرونا'' تو ایک وبا کی صورت میں ساری دنیا میں آیا، جس میں مبتلا ہوکر لاکھوں انسانوں کی ہلاکت ہوچکی، اور ابھی اس کا قہر جاری ہے۔ تاہم طاعون، ملیریا، ڈینگو اور چکن گنیا جیسی متعدد وباؤں اور ان سے ہونے والی انسانی ہلاکتوں کی وجہ سے انسانی بستیوں میں وباؤں کے آتے رہنے کا ایک تجربہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک وبا کے ایک ساتھ پوری دنیا میں اس

طرح پھیلنے اور اتنی بڑی تعداد میں انسانی جانوں کی ہلاکتوں کا نہ صرف پہلا تجربہ ہوا بلکہ قادر ومقتدر اللہ کی قدرت کاملہ کا یہ نمونہ بھی سامنے آگیا کہ اس کی بھیجی ہوئی ایک نامعلوم اور ان دیکھی وبا کا مقابلہ کرنے سے ساری دنیا کے ڈاکٹر، سائنس داں، اپنے کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنے والے ملحدین، اور ارض وسماء پر اقتدار وحاکمیت کے دعویدار تمام حکمراں وارباب اقتدار اس طرح بے بس ولاچار نظر آئے کہ کم وبیش ایک برس کا عرصہ گذر جانے کے باوجود اب تک نہ اس کے دفاع کے لئے کوئی دوا یا ویکسین بن سکی ہے، نہ ہی اس وبا سے نجات کے لئے مستقبل کے کسی وقت کی تعیین کرنے کی کسی کے اندر ہمت ہے؟۔

کیا اب بھی اس کائنات کے ایک اکیلے خالق ومالک اور اس کی ناقابل شکست قدرت وگرفت سے انکار کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟۔

ان تمام تفصیلات کے ساتھ ''کرونا'' اور اس کا قہر اپنی جگہ، لیکن اس کی ''رعایت'' میں لگنے والا ''لاک ڈاؤن''؟؟ ـــــ **الحفیظ الامان الحذر**۔ جہاز اور ریل سے لے کر سائیکل اور سائیکل رکشہ تک تمام سواریاں بند، عبادت گاہوں وتفریح گاہوں سے لے کر بازار ہاٹ سب بند۔ اسکول کالج مدرسے اور پاٹھ شالے سب بند۔ منڈیاں شاپنگ مالس سے لے کر میٹنگ ہال اور میرج لان تک سب بند، گھروں سے باہر نکلنے ہی نہیں، مریضوں کو ہسپتال اور مُردوں کو شمشان یا قبرستان پہنچانے پر بھی طرح طرح کی پابندیاں؟۔ غرضیکہ صورت حال کچھ یوں کہ ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ہمارے ملک میں ۲۴/مارچ ۲۰۲۰ء سے لگنے والے ''لاک ڈاؤن'' کے دوران چوں کہ زندگی کی رفتار بالکل تھم گئی تھی۔ اس لئے کتابوں اور اخبار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ فون کے ذریعہ اپنوں بلکہ ''بھولے بسروں'' سے بھی فون کے ذریعہ رابطہ کے خوب خوب مواقع ملتے رہے۔ انٹرنیٹ کے اس دور میں

دور دراز کے احوال سے باخبر رہنا بھی آسان تھا۔ اچھی بری ہر قسم کی خبریں ملتی رہیں، البتہ خوش کن اور مسرت بخش خبروں کے مقابلہ تکلیف دہ اور رنج رساں خبریں کچھ زیادہ ہی ملیں۔ بڑی تعداد میں علماء واکابر، دوست احباب، اور اعزہ واقارب کی اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی اطلاعات نے کچھ زیادہ ہی رنجور ومغموم کیا، خصوصاً وہ لوگ جن کی نماز جنازہ، اور آخری منزل تک پہنچا کر عام حالات میں تسکین قلب کا کچھ سامان بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن ''خانہ قید'' ہونے کی وجہ سے اس سعادت سے بھی محرومی رہی — ان میں سے کچھ وہ بھی تھے جن سے جدائی کے کرب کو کبھی کسی کی فرمائش پر اور کبھی صرف اپنی اور دنیا سے کوچ کرنے والے اعزہ کے پسماندگان کی دل جوئی کے لئے صفحات قرطاس پر بکھیرتا رہا۔ دھیرے دھیرے کر کے ایسے کئی مضامین ہوگئے۔ میرا ماہنامہ رسالہ ''البدر'' لاک ڈاؤن کی زد میں آکر ''پابند سلاسل'' نہ ہوا ہوتا تو ان مضامین کی اس میں اشاعت ہوجاتی — اس لئے ان میں کے بیشتر مضامین کو لکھ لکھ کر اپنے پاس اس امید پر کہ ''یہ وقت بھی گذر جائے گا'' اور جب ان شاء اللہ ''البدر'' کی اشاعت بحال ہوگی تو اس میں انہیں شائع کیا جائے گا۔ اپنے پاس محفوظ کرتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا؟ — اسی دوران میرے فرزندان مفتی حارث عبدالرحیم قاسمی اور مولوی معاویہ عبدالرحیم ندوی نے یہ سجھایا کہ کیوں نہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کردیا جائے؟ جب اس کا ذکر آیا تو دوسرے کئی احباب نے بھی تائید کی — اور پھر جب میرا ذہن بھی اس پر آمادہ ہوگیا تو خیال آیا کہ اس سلسلہ کے ایسے بھی کئی مضامین ہیں جن کی اشاعت ''لاک ڈاؤن'' سے پہلے ''البدر'' یا کسی دوسری جگہ ہوچکی ہے، انہیں بھی کتاب میں شامل کرلیا جائے تو محفوظ ہوجائیں گے — اور ؎

خاک میں مل جائے گا جب میری ہستی کا نشاں
تازہ ہوگی یادگارِ زیست اس تحریر سے

مضامین کی ترتیب کے بعد کتاب کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا۔ کئی نام تجویز

ہونے کے بعد بالآخر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب کا نام ''اکثر یاد آتے ہیں'' رکھا جائے، جب کہ اسی موضوع پر اب سے کئی برس پہلے میری ایک دوسری کتاب ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' کے نام سے شائع ہوکر قارئین سے پسندیدگی کی سند حاصل کرچکی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں زیادہ تر عظیم القدر و لائق احترام شخصیات کا ذکر ہے، جب کہ زیر نظر کتاب میں بیشتر ''میری محبوب'' شخصیات کا ذکر ہے اور عظمت واحترام ان کی اضافی صفات ہیں، انتخاب کی بنیاد نہیں؟۔

ہمیں جتنا یقین اس بات کا ہے کہ اس کتاب میں جن شخصیات کا ذکر ہے ان سب ہی سے بہت کم قارئین کو مناسبت ودلچسپی ہوگی۔ اتنا ہی اس بات کا بھی یقین ہے کہ اردو زبان وادب کا کوئی قاری شاید ہی ایسا ہو کہ جس کی کسی نہ کسی پسندیدہ یا کسی بھی حوالہ سے رابطہ میں آنے والی شخصیت کا اس کتاب میں ذکر نہ ہو؟ اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دین وادب اور اردو زبان کے ہر قاری کے لئے اس کتاب میں کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور ہے —— لیکن شرط یہ ہے کہ کم از کم فہرست مضامین ہی کو غور سے پڑھ لیا جائے ....؟؟۔

کتاب کے مصنف ومرتب کو اپنے بارے میں نہ کوئی غلط فہمی ہے نہ ہی اپنی بے ربط وٹوٹی پھوٹی تحریر میں کسی جاذبیت وچاشنی کا گمان — وہ تو اپنے قلبی واردات کو ضبط تحریر میں لاکر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنے کو مخاطب کرکے صرف اتنا کہنا چاہتا ہے کہ ؎

ترا سیدھا سادا بیان ہے ☆ تری ٹوٹی پھوٹی زبان ہے
ترے پاس ہیں یہی ٹھیکرے ☆ تو محل ان ہی سے بنائے جا

عبدالعلی فاروقی

ابراہیم منزل، پاٹا نالہ، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳

۲۳؍دسمبر ۲۰۲۰ء مطابق ۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

Mohammad Rabey Hasani Nadwi — محمد الرابع الحسني الندوي

P.O. Box No. 93, Lucknow-226007 (INDIA)
Phones : (0522) 2740151, 2741316 Fax : 2741231
E-mail : rabeynadwi@yahoo.com

ندوة العلماء ص۔ ب۔ ۹۳۔ لکھنؤ (الھند)

التاریخ ________ الرقم ________

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين وبعد!

انسان کی سیرت کی تشکیل میں اس کے سرپرستوں اور قریبی رفقاء کی صحبت کا گہرا اثر ہوتا ہے، اس لیے لوگوں کی صحبت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، چنانچہ جس کو اچھی صحبت ملتی ہے، وہ آسانی سے اچھا انسان بن جاتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو اچھی مدد ملتی ہے، اصل فائدہ تو براہ راست صحبت کا ہوتا ہے؛ لیکن شخصیات کے حالات وکمالات سے واقفیت بھی براہ راست صحبت کے فائدہ کی قائم مقام بنتی ہے، اس لیے شخصیتوں کی سوانح اور تذکروں سے اچھا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں سوانح اور تذکروں کا بڑا سرمایہ موجود ہے، تذکرہ اور سوانح نگاروں نے اہل فضل وکمال کی زندگیوں اور ان کے کارناموں کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کردیا ہے، تاکہ وہ ان کے سیرت وکردار سے واقف ہوں اور اپنی زندگیوں کو صحیح خطوط پر استوار کرسکیں۔

شخصیات کے تعارف میں طویل مقالات اور تحقیقی مضامین کے مقابلہ میں مختصر تذکروں اور خاکوں کو ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے، اور آج کے اس مشینی دور میں جب ہر شخص مصروف عمل ہے، مختصر تذکروں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، تذکرہ کے لیے شخصیات کے انتخاب میں اگر یہ کہا جائے کہ تذکرہ نگار کے ذوق، مزاج اور رجحان کا بڑا دخل ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تذکرہ نگار انہی شخصیات کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جن سے وہ متاثر ہوتا ہے، محبت کرتا ہے، عقیدت رکھتا ہے، جن سے اس کو جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، فکری ہم آہنگی ہوتی ہے، مزاج اور طبیعت میں یکسانیت ہوتی ہے اور جن کا تذکرہ دوسروں کے لیے مفید اور کارآمد سمجھتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس عہد اور عہد کے مسائل اور تقاضوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، حوصلہ ملتا ہے، ہمت بڑھتی ہے، اور کام کی مختلف راہیں سامنے آتی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''اکثر یاد آتے ہیں'' مختلف حیثیتوں سے ممتاز اور مختلف میدانوں کی منتخب شخصیتوں کا مجموعہ ہے جو اپنے انتخاب اور اختصار میں اہمیت کا حامل ہے، اس تذکرہ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک معروف صاحب علم مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب کے قلم سے ہے جنہیں لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے، اس مجموعہ میں مختلف ذوق ورجحان رکھنے والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا کہ اس میں عالم ومصنف بھی ہیں، شاعر وادیب بھی، فقیر ودرویش بھی، سیاست وخدمت ملی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، نامور بھی، گمنام بھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا اور اس سے اہل فضل وکمال کی خدمات وخصوصیات سے واقفیت حاصل ہوگی اور اس سے ضروری فائدہ حاصل کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

(محمد رابع حسنی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ
۱۱/ دسمبر ۲۰۲۲ء

رئيس ندوة العلماء، و رئيس هيئة الأحوال الشخصية الإسلامية لعموم الهند، وعضو المجلس التأسيسي لرابطه العالم الإسلامي بمكة المكرمة و نائب رئيس رابطه الأدب الإسلامي العالمية، ورئيس المجمع الإسلامي العلمي، و رئيس المجلس التعليمي الديني، و عضو مركز أوكسفورد للدراسات الإسلامية

Nazim (Rector) Nadwatul Ulama, President All India Muslim Personal Law Board, Member World Muslim League Makkah, Vice President Universal League for Islamic Literature, President Academy of Islamic Research & Publication, President Deeni Taleemi Council, Member Oxford Center for Islamic Studies - Oxford (U.K.)

مقدمہ

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

الحمدللّٰہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین سیدنا محمد بن عبداللّٰہ الأمین، و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین، و علی من تبعھم بإحسان و دعا بدعوتھم إلی یوم الدین و بعد!

انسان کی سیرت کی تشکیل میں اس کے سرپرستوں اور قریبی رفقاء کی صحبت کا گہرا اثر ہوتا ہے، اس لئے لوگوں کی صحبت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، چنانچہ جس کو اچھی صحبت ملتی ہے، وہ آسانی سے اچھا انسان بن جاتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو اچھی مدد ملتی ہے، اصل فائدہ تو براہ راست صحبت کا ہوتا ہے؛ لیکن شخصیات کے حالات وکمالات سے واقفیت بھی براہ راست صحبت کے فائدہ کی قائم مقام بنتی ہے، اس لئے شخصیتوں کی سوانح اور تذکروں سے اچھا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں سوانح اور تذکروں کا بڑا سرمایہ موجود ہے، تذکرہ اور سوانح نگاروں نے اہل فضل وکمال کی زندگیوں اور ان کے کارناموں کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کردیا ہے، تاکہ وہ ان کے سیرت وکردار سے واقف ہوں اور اپنی زندگیوں کو صحیح خطوط پر استوار کرسکیں۔

شخصیات کے تعارف میں طویل مقالات اور تحقیقی مضامین کے مقابلہ میں مختصر تذکروں اور خاکوں کو ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے، اور آج کے اس مشینی دور میں جب ہر شخص مصروف عمل ہے، مختصر تذکروں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، تذکرہ کے لئے شخصیات کے انتخاب میں اگر یہ کہا جائے کہ تذکرہ نگار کے ذوق، مزاج اور رجحان کا بڑا دخل ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تذکرہ نگار انہی شخصیات کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جن سے وہ متاثر ہوتا ہے، محبت کرتا ہے، عقیدت رکھتا ہے، جن سے اس کو جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، فکری ہم آہنگی ہوتی ہے، مزاج اور طبیعت میں یکسانیت ہوتی ہے اور جن کا تذکرہ دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد سمجھتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس عہد اور عہد کے مسائل اور تقاضوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، حوصلہ ملتا ہے، ہمت بڑھتی ہے، اور کام کی مختلف راہیں سامنے آتی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''اکثر یاد آتے ہیں'' مختلف حیثیتوں سے ممتاز اور مختلف میدانوں کی منتخب شخصیتوں کا مجموعہ ہے جو اپنے انتخاب اور اختصار میں اہمیت کا حامل ہے، اس تذکرہ کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک معروف صاحب علم مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب کے قلم سے ہے جنہیں لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے، اس مجموعہ میں مختلف ذوق ورجحان والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا کہ اس میں عالم ومصنف بھی ہیں، شاعر وادیب بھی، فقیر ودرویش بھی، سیاست وخدمت ملّی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، نامور بھی، گمنام بھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا اور اس سے اہل فضل وکمال کی خدمات وخصوصیات سے واقفیت حاصل ہوگی، اور اس سے ضروری فائدہ حاصل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ، ۱۱/ دسمبر ۲۰۲۲ء

میری امّاں —— یعنی —— میری نانی؟

میں نے اپنی ایک کتاب ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' کا انتساب کچھ یوں کیا تھا:

''اس صبر وشکر کی پیکر خاتون کے نام
جس نے مجھ پر اپنی محبت کے ڈونگرے لٹاتے ہوئے بھی اپنے ذوق عبادت کی تسکین کا سامان اس طرح کیا کہ
ہر مشکل گھڑی اور ہر تعلیمی امتحان کے موقع پر اس نے مجھے نماز حاجت پڑھ کر رخصت کیا، اور میری کامیابی کا استقبال نماز شکرانہ ادا کر کے کیا —— کیوں کہ وہ بڑے اعتماد و یقین کے ساتھ اور بڑے پرسوز انداز میں یہ شعر گنگنایا کرتی تھیں کہ

ضائع نہ جائے گی کبھی محنت نماز کی
اللہ دینے والا ہے اجرت نماز کی

یعنی

نانی محترمہ **وافیہ خاتون** کے نام —— جنہیں میں نے ہمیشہ امّاں کہہ کر ہی مخاطب کیا —— اور شدید چاہت کے باوجود ان کا تذکرہ یہ سوچ کر میں اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا کہ دوسروں کے لئے ان کے تذکرہ میں دلچسپی کا کیا سامان؟

—— وہ تو بس میری امّاں تھیں ''

زندگی ہے نام جہد وجنگ کا
موت کیا ہے بھول جانا چاہیئے''

اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے میرے کئی باذوق احباب نے مجھ سے کہا کہ تم نے اپنے ''انتساب'' میں اپنی نانی صاحبہ کا کوئی تفصیلی تذکرہ نہ کر کے بھی کچھ ایسا ان کے بارے میں لکھ دیا کہ اب ان کے کچھ تفصیلی حالات لکھنا بھی تم پر لازم ہو گیا ہے —— مجھے یہ سن کر واقعی اچھا لگا تھا کہ میری نانی مرحومہ جنہیں میں واقعی بس ''اپنی اماں'' ہی کی حیثیت سے جانتا، چاہتا، اور کبھی شدت سے ان کی یاد آنے پر دو آنسو بہا کر ان کے لئے دعائے مغفرت کر لیا کرتا تھا —— دوسرے بھی ان کے کچھ حالات زندگی جاننے کے طلب گار نظر آئے؟ میں نے احباب کی اس پذیرائی پر وعدہ بھی کر لیا کہ ہاں کچھ لکھوں گا —— اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

کم و بیش تین برس کے بعد میری ایک اور نئی کتاب ''یادوں کے جھروکوں سے'' کی رسم اجراء کے لئے میرے عزیز وقدرداں وصی صدیقی بانی جنرل سکریٹری ''محمد علی جوہر فاؤنڈیشن'' لکھنؤ نے اپنے دفتر میں ایک محفل سجائی، جس میں انہوں نے اپنے حلقۂ احباب اور میرے کرم فرماؤں کو اتنی بڑی تعداد میں جمع کر لیا کہ منظر کسی کتاب کے ''رسم اجراء'' کا نہیں، بلکہ کسی باقاعدہ اعلان شدہ جلسہ کا تھا؟ —— پھر یہ مجمع عوام کا نہیں بلکہ خواص کا تھا، جس میں علمائے کرام، شعرائے عظام، اور ادیب ودانشور سب ہی شامل تھے۔

بہت باوقار انداز میں اور بہت معتبر ہاتھوں سے کتاب کی ''رسم اجراء'' انجام پائی —— اور روایتی طور پر کتاب، نیز کتاب کے مصنف کے سلسلہ میں کچھ منتخب حضرات نے اپنی آراء کا اظہار کیا —— ان اظہار رائے کرنے والوں میں ایک میرے بہت ہی قابل احترام کرم فرما مولانا پروفیسر شبیر احمد

ندوی (سبکدوش صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی) بھی تھے۔ جنہوں نے میری ذات اور میری اس کتاب کے بارے میں تو جو کچھ کہا اسے میں ''خرد نوازی'' اور حوصلہ افزائی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوں —— کیوں کہ میں نے خوب دیکھا اور برتا ہے کہ باوقار بڑے، اسی طرح اپنے خردوں کو آگے بڑھا کر کام پر لگاتے ہیں —— لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ آں موصوف نے میری پچھلی کتاب ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' کے حوالہ سے ''نانی مرحومہ'' پر تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنے کی باصرار فرمائش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ

''مولانا............ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اگر وہ ان کی اماں ہیں تو ان بلند کردار خاتون کے حالات جاننے کا دوسروں کو حق نہیں ہے؟''

اور پھر ہوا یہ کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس بات کی اسٹیج پر پرزور تائید ہوگئی، اور اسٹیج سے لے کر اسٹیج کے بعد تک ڈاکٹر صاحب سمیت متعدد لوگوں نے کچھ اس خلوص و پیار کے ساتھ مجھ سے اس کام کو انجام دینے کے لئے اصرار کیا کہ میں نے ''اظہار جذبات'' سے زیادہ ایک نیک کام سمجھ کر اسے انجام دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اور مجھے اس بات پر یقین کرنا پڑا کہ ؎

محبت کرنے والا زندگی بھر کچھ نہیں کہتا
کہ دریا شور کرتا ہے سمندر کچھ نہیں کہتا

میں نے اپنے نانا صاحب کو نہیں دیکھا۔ انہیں تو میری والدہ مرحومہ نے بھی دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا تھا، کہ اپنی ماں (نانی صاحبہ) کی یہ اکلوتی بیٹی ابھی صرف دو ماہ کی تھی کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئی اور میری نانی صاحبہ بھری جوانی میں جب کہ ان کی عمر ابھی صرف ۱۹؍ سال تھی، بیوہ ہوگئیں۔

میں نے آنکھ کھول کر نانی صاحبہ کو اپنے ساتھ اپنے ہی گھر میں دیکھا —— اور نہ صرف دیکھا، بلکہ ان کی گود میں پلا بڑھا، اور ان کی ثمر بار دعاؤں

کے زیر سایہ پروان چڑھا۔ کیوں کہ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے مرحوم شوہر کی امانت، یعنی اپنی گود میں موجود صرف دو ماہ کی بچی کی پرورش و پرداخت کی خاطر دوبارہ نکاح کر کے اپنا گھر پھر سے آباد نہ کرنے کا قطعی اور حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ والد حیات تھے، وہ اپنی جوان العمر بیوہ بیٹی کو اپنے گھر لے آئے، یہاں سوتیلی ماں اور بھائی بہنوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ہر طرح دل جوئی کرنے کے ساتھ ہی وقتاً فوقتاً دوبارہ گھر آباد کرنے پر اصرار بھی کیا۔ مگر نانی مرحومہ اپنے ''فیصلہ'' پر قائم رہیں —— حتیٰ کہ ان کے والد کی وفات ہوگئی، ان کی لاڈلی بیٹی نے ان کی آغوش محبت میں پل کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا، اور ابھی اس کی عمر صرف چودہ برس کی ہوئی تھی کہ انہوں نے میرے والد ماجدؒ کے ساتھ عقد کر کے اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

اور پھر کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب، نانی صاحبہ کو بھی ان کی اکلوتی بیٹی ہی کے پاس لے آئے جس کی خاطر انہوں نے اپنی جوانی، اور جوانی کے سارے ارمانوں کو تج دیا تھا —— یہ سب کچھ میرے اس عالم آب و گل میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میں نے تو نانی صاحبہ کی آغوش کو اپنی اماں کی آغوش سمجھ کر پرورش پائی۔ دو بڑی بہنوں کی موجودگی اور ایک بڑی بہن اور بڑے بھائی کی کم سنی ہی میں موت ہو جانے کی وجہ سے میرے چاؤ چوچلے کچھ زیادہ ہی تھے، اس پر مستزاد اماں کی آغوش نے مجھے اور بھی ''خاص الخاص'' بنا دیا تھا۔

میں نے ''اپنی اماں'' کو صبر و شکر کا پیکر لکھا —— تو بہت سوچ سمجھ کر لکھا۔ ماں کی آغوش رحمت سے بہت کم سنی ہی میں محروم ہوگئیں۔ باپ نے ان کی شادی کر کے اپنے گھر والا بنایا تو بھری جوانی میں سہاگ اجڑ گیا، شوہر کی یادگار ایک دودھ پیتی بچی کو لے کر باپ کے گھر پلٹ کر آئیں تو سایۂ پدری بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا —— ایک ایک کر کے دنیا کے عارضی سہارے ٹوٹے تو رحمت خداوندی نے سہارا بن کر انہیں اپنی آغوش میں لے

لیا۔اور جب یہ پائیدار ولا زوال سہارا ملا تو وہ بس اسی کی ہو کر رہ گئیں۔

ایک بیٹی کی ذات سے انہیں اللہ تعالیٰ نے بھرا پرا کنبہ عطا کیا۔ تین نواسیوں اور چار نواسوں میں سے تین کے گھر آباد ہوتے ہی نہیں دیکھا، بلکہ ان کے بچوں کو کھلا پلا کر ان میں سے کئی کی شادی بیاہ بھی دیکھی۔ صرف ایک سب سے چھوٹے نواسہ عبدالوحید سلّمہٗ کا گھر ان کے انتقال کے بعد آباد ہوا۔

میرا معاملہ سب سے مختلف رہا، کیوں کہ وہ اپنی تمام نواسیوں، نواسوں، اور ان کی اولاد کی نانی تھیں، جب کہ صرف اپنی بیٹی یا پھر میرے لئے ''میری اماں'' تھیں۔ مجھ سے صرف پونے دو سال بڑی بہن ''ہماری امی'' کی گود میں تھیں، اس لئے بچپن سے ہی ''میری اماں'' مجھے اپنے پاس ہی سلاتی تھیں۔ میری پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا تو جتنی دیر میں اپنا سبق یاد کرتا، میری اماں میرے بغل میں بیٹھ کر پنکھا جھلا کرتی تھیں۔ میرے حفظ کے استاذ حافظ سید علی صاحب مرحوم مجھے ٹیوشن کے طور پر پڑھانے کے لئے بھی آتے تھے۔ میرے حافظ جی بے حد مشفق تھے لیکن پڑھائی کے معاملہ میں کسی سمجھوتہ کو روا نہیں رکھتے تھے، وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ ''میں رانگا نہیں لوہا بناتا ہوں'' اور یہ لوہا بنانے کے لئے وہ اپنے بچوں (شاگردوں) کے جسموں کو بھی اپنی ضربوں کے ذریعہ لوہا بنانا ضروری سمجھتے تھے؟ چوں کہ اس دور میں یہ تصور عام تھا کہ حفظ قرآن کے لئے مار پیٹ لازمی ہوتی ہے۔ اس لئے والدین اپنے حفظ کرنے والے بچوں کو یہ سمجھ کر اساتذہ کے حوالہ کرتے تھے کہ بچوں کو اپنے استاذوں کی مار بھی کھانا ہے؟ میرے حافظ جی پڑھانے آتے تو میں گھر کے بالکل متصل مسجد میں پڑھنے کے لئے چلا جاتا، اور ''میری اماں'' گھر کی اس کھڑکی پر جو مسجد کے رخ پر تھی، بیٹھ کر دعا میں مشغول ہو جاتیں کہ ''اے میرے اللہ! میرا بچہ صحیح سنا دے، اس کا سبق اور آموختہ خوب پکا یاد نکلے، وہ ''سید علی'' کے ہاتھ کی مار نہ کھائے............اس دوران اگر میری پٹائی ہوتے ہوئے ''میری اماں'' دیکھ

لیتیں، یا میرے رونے چلانے کی آواز سن لیتیں، تو بے چین ہو کر کھڑکی پر سے ہٹ جاتیں، اور آنسو بہا بہا کر میرے لئے ''نجات'' کی دعا کرتی رہتیں —— کوئی پوچھ لیتا کہ کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہیں؟ تو جواب میں بہت ہی بے چارگی کے ساتھ جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں کہتیں ''ارے سید علی ظالم میرے بچے کو مارے ڈال رہا ہے''۔ میری والدہ اگر انہیں سمجھانے کی کوشش میں کہتیں کہ ''اماں! وہ ظالم نہیں ہیں، آپ ہی کے بچہ کی بھلائی کیلئے تنبیہ کرتے ہیں، بچہ جب یاد کر کے نہیں سنائے گا تو مار تو کھائے گا ہی'' —— والدہ کی یہ ''فہمائش'' ''کٹے پر مرچ'' کا کام کرتی، اور اماں بپھر کر اپنی بیٹی سے کہتیں ''ارے تو ماں نہیں، ڈائن ہے۔ تیرے دل میں نہ خدا کا خوف ہے، نہ بچہ کی محبت ہے۔ ابھی اس کی کیا بساط ہے؟ (میرا حافظہ بہت ہی کم عمری میں جب کہ میری عمر ۸؍سال کی تھی مکمل ہو گیا تھا) ننھی سی جان کو اس ظالم کے ہاتھوں ہلاک کرا دینا چاہتی ہے؟ بھائی صاحب (یعنی میرے دادا صاحب مرحوم) کا شوق وارمان نہ ہوتا تو اپنے بچہ کو حافظ کرنے کے لئے کبھی نہ داخل ہونے دیتی —— ارے ننھی سی جان پر اتنا بوجھ اور اتنا ظلم، اور یہ ''سنگدل ماں'' ہے جو خوشی خوشی سب برداشت کر رہی ہے؟

ایک طرف تو یہ ہوتا، اور پھر دوسری طرف جب مجھے سبق یاد کرانے کے لئے لے کر بیٹھتیں تو کیسے کیسے چاؤ اور پیار سے مجھے سمجھاتیں کہ میرے بچے، کوئی تمہارا دشمن تھوڑی ہے، جی لگا کر پڑھو جلدی سے یاد کر لو، میرا بچہ حافظ قرآن بنے گا، اس کی پگڑی بندھے گی، خوب دھوم دھام سے دعوت ہوگی، پھر قیامت کے دن اللہ میاں اس سے اتنا خوش ہوں گے کہ ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، سب کو بادشاہوں والے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تاج پہنائے گا ....وغیرہ وغیرہ۔

میری اماں کا جب ۱۹۹۳ء میں انتقال ہوا تو میرے ساتوں بیٹوں،

بیٹیوں کی پیدائش ہو چکی تھی، بلکہ ماشاءاللہ بڑے بچے تو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ میں اگر بوڑھا نہیں تو ''ادھیڑ'' ضرور ہو چکا تھا —— اس کے باوجود میرے کھانے پینے سے لے کر میری بیوی بچوں کی طرف سے ''میری اماں'' اس طرح فکر مند رہتیں جیسے کوئی ماں اپنے کم سن بچہ کے لئے رہتی ہے، گھر سے مدرسہ کے لئے روانگی ہو، یا کسی سفر پر جانا ہو، کوئی تعلیمی امتحان دینا ہو، یا رمضان میں تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے مسجد جانا ہو —— میں سب سے آخر میں اپنی اماں کو بتا کر اور ان کی دعائیں لیتا ہوا ہی رخصت ہوتا تھا۔اماں کو گھڑی سے ٹائم دیکھنا نہیں آتا تھا، مگر وہ گھر کے دیگر افراد سے پوچھ پوچھ کر واپسی کے مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی سے میرا انتظار کرنے لگتی تھیں۔کسی دن کوئی عذر پیش آجانے کی وجہ سے واپسی میں تاخیر ہو جاتی تو اماں بے چین ہو جاتی تھیں —— کبھی کچھ زیادہ ہی دیر ہوتی تو اماں نماز شکرانہ مان کر، اور تسبیح ہاتھ میں لئے ٹہل ٹہل کر بڑی ہی بے قراری کے ساتھ اپنے رب سے لو لگا کر، میری خیر و عافیت سے واپسی کے لئے نہ جانے کس کس طرح بھیک مانگتی رہتیں —— اور جب واپس آکر انہیں سلام کرتا تو مجھے دیکھ کر وہ یکدم بپھر جاتیں —— کہاں رہ گئے تھے؟ کیوں مجھے ستاتے ہو؟ کیا میری جان کے دشمن بن گئے ہو؟ تم میری جان لے کر سدھرو گے؟ —— خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے اپنی رو میں اماں میرا کوئی عذر سننے کو روادار نہ ہوتیں —— بالآخر تھک ہار کر مجھے تو کھانے پینے اور آرام کرنے کے لئے بھیج دیتیں اور خود مصلیٰ بچھا کر شکرانہ ادا کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔
نماز سے تو انہیں عشق کی حد تک محبت ہی نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے خالق و مالک سے ''اپنی منوانے'' کے لئے بڑے اعتماد اور بھرم کے ساتھ بہ طور ''ہتھیار'' نماز کا استعمال کرتی تھیں۔پنج گانہ نمازوں کے ساتھ ہی تہجد، صلوٰۃ التسبیح، اشراق، چاشت، اور اوابین کی ادائیگی پابندی کے ساتھ روز کا معمول تھا۔ذکر و اذکار اور

تسبیح گردانی کی کثرت کا عالم یہ تھا کہ جب تسبیح کے دانے گھس کر اتنے چھوٹے ہو جاتے کہ ان کی چٹکی میں نہ آپاتے تو انہیں دوسری نئی تسبیح دے دی جاتی۔میں نے ایک مرتبہ ریڈیم کے بڑے دانوں کی تسبیح انہیں یہ بتا کر دی کہ ایک حاجی صاحب نے لاکر دی ہے تو اس تسبیح کو پاکر وہ ایسا خوش ہوئیں اور مجھے نیز تسبیح لانے والے حاجی صاحب کو اس طرح منھ بھر بھر کر دعائیں دیں کہ میں اس منظر کو تا عمر فراموش نہیں کر سکتا۔پھر اسی وقت نہیں، بلکہ رات کے اندھیرے میں جب جب وہ چمکتے ہوئے دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لیتیں تو اپنا ذکر و اذکار شروع کرنے سے پہلے ہمیں دعائیں دینا نہیں بھولتی تھیں۔
کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلتی اور اپنی اماں کو نہایت ہی سوز و گداز کے ساتھ بلند آواز میں اپنے رب سے تڑپ تڑپ کر یوں مانگتے سن لیتا کہ۔

رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں یارب تو نہ ہم کو بھول جا

تو میری نیند اچٹ جاتی اور میں گھبراہٹ کے عالم میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتا، اور اپنی اماں کو روتے دھوتے دیکھ کر کچھ سمجھے بغیر چپکے چپکے خود بھی آنسو بہانے لگتا۔''عالم وارفتگی'' سے واپس آکر اماں کی مجھ پر نگاہ پڑتی تو وہ مصلیٰ چھوڑ کر میرے پاس آجاتیں۔اور میں جب پوچھتا کہ اماں کیوں رو رہی تھیں؟ تو وہ میری بساط کی رعایت کرتے ہوئے بس اتنا کہہ دیتیں کہ ''کچھ یاد آ گیا تھا'' اور میرے آنسو پوچھتے ہوئے مجھے دلاسہ تسلّی دے کر پھر سلا دیا کرتی تھیں؟
مجھے بہت ہی شرمندگی کے ساتھ اپنی اس ناقدری اور محرومی کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں نے اپنی اماں کو پاکر، ان کی گود میں پل کر، اور ان کی دعاؤں سے بہت کچھ پاکر بھی انہیں پہچانا نہیں۔ان کی نازبرداریوں اور لاڈ و پیار سے میں اتنا بگڑ گیا کہ میں نے بس اتنا ہی سمجھا اور برتا کہ وہ ''میری اماں''

ہیں، اور بس! حالانکہ اب ان کے اپنے رب سے مضبوط و مستحکم رشتے، اور دنیا
اور متاع دنیا سے بقدر کفاف تعلق پر غور کرتا ہوں تو ایک یقین سا ہو جاتا ہے وہ
''خدا رسیدہ بزرگ'' کا صحیح مصداق تھیں۔ حالانکہ مجھے یاد ہے کہ میری ایک
رشتہ کی پھوپھی مرحومہ نے (جو خود بھی بہت پابند اوقات تھیں) کئی مرتبہ ہم
بھائی بہنوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ چتاونی بھی دی کہ تم لوگ اپنی نانی صاحبہ کو
سمجھ نہیں پا رہے ہو، وہ بہت ہی اللہ والی اور بزرگ ہیں، جب وہ نہیں رہیں گی
تب تم لوگ یاد کروگے؟ اس کے باوجود ہماری غفلتوں کے پردے نہیں ہٹے
—— مرحومہ پھوپھی صاحبہ تو موقع بہ موقع صرف اماں ہی سے ملنے کے لئے
آتیں، چپکے چپکے ان سے باتیں بھی کرتی جاتیں، اور ان کے ہاتھ پیر بھی دباتی
جاتیں، اور پھر ان سے دعائیں لے کر ہم لوگوں سے ''واجبی دعا سلام'' کرتی
ہوئی اپنے گھر واپس چلی جاتیں —— لیکن مجھے اپنی ''آوارہ مزاجی
وناقدری'' نے یہ سب کرنے کا کبھی موقع نہیں دیا —— اور اب جب یہ
حسرت ناکام انگڑائیاں لیتی ہے کہ ع

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

تو بے ساختہ اپنا ہی ضمیر ملامت کرتے ہوئے زوردار طمانچہ رسید کرکے کہہ دیتا
ہے کہ ع

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی؟

میری اماں نے ۱۸؍جولائی ۱۹۹۳ء کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی تو فجر
کی اذان ہو رہی تھی، وہ بالکل چت لیٹی تھیں اور ان کے دونوں ہاتھ سینے پر اس
طرح تھے جیسے نماز ادا کر رہی ہوں۔ ان کے داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی
اوپر اٹھی ہوئی تھی اور ان کی ہر وقت کی ساتھی ''ان کی تسبیح'' بائیں بازو میں پڑی
ہوئی تھی —— اور ہم سب ان کی چارپائی کے اغل بغل کھڑے ان کے نواسی
نواسے، اور ان کی دنیا کی کائنات ان کی اکلوتی بیٹی، ان کی روح قفس عنصری

سے پرواز ہوتے دیکھ کر یہی سوچنے اور کہنے پر مجبور تھے کہ ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

میری اماں اپنے پیچھے بھرا پرا کنبہ چھوڑ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے وقت
ان کی ایک لڑکی کی ذات سے ان کے تیرہ نواسے اور پرنواسے حافظ قرآن گھر
ہی میں موجود تھے۔ میں نے گھر میں موجود سب مردوں عورتوں کو مخاطب کر کے
کہا تھا کہ کسی کا رونا دھونا ان کے کام نہیں آئے گا۔ محبت ہو تو قرآن مجید کی
تلاوت، اور کلمہ طیبہ کی تسبیح پڑھ کر ان کے لئے ایصال ثواب کرو ——
۱۲؍بجے دن میں کاکوری کے آبائی قبرستان میں تدفین کے لئے ان کا جنازہ
اٹھایا گیا تو بفضلہ تعالیٰ ذکر واذکار کے علاوہ دو قرآن مکمل پڑھ کر ان کے لئے
ایصال ثواب کیا جا چکا تھا۔ امید کہ حق تعالیٰ نے ضرور شرف قبول بخشا ہوگا۔
میری اماں کی اصل میراث یہی تھی، جس نے بفضل اللہ تعالیٰ ان کے
بعد اور بھی ترقی کی ہے —— ویسے اماں کے بعد ان کی ٹین کی چھوٹی سی پیٹی
کھول کر ''متاع دنیا'' سے ان کی میراث تلاش کی گئی تو منظر کچھ یہ تھا کہ ؎

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میں احسان مند ہوں اپنے مالک وخالق کے بعد اپنے والدین کریمین،
اپنی پھوپھیوں پھوپھاؤں، اپنے تمام بھائی بہنوں، اور اپنے تمام چھوٹوں بڑوں
کا بھی، اور اپنے مشفق اساتذہ کرام کا بھی کہ اپنی کسی کارگذاری یا صلاحیت کے
بغیر ہر ایک سے مجھے بے پناہ محبتیں بھی ملیں اور دعائیں بھی —— مگر محبت اور
دعاؤں کا وہ انداز جو ''میری اماں'' سے مجھے حاصل ہوا، وہ تو ''میری اماں'' کے
اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد پھر نہ مل سکا کہ میں ذرا گمبھیر لہجہ میں سنجیدگی
کے ساتھ انہیں اپنی کوئی مشکل یا پریشانی بتا کر ان سے دعا کے لئے کہتا تو فوراً دعا

کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے نمازِ شکرانہ بھی مان لیتیں —— اور اپنے رب پر بھروسہ کرکے کچھ ایسے پُراعتماد لہجہ میں مجھے ڈھارس بندھاتیں کہ مجھے اسی وقت یقین سا ہو جاتا کہ "میرا مسئلہ حل ہو گیا"۔

اور اب بشیر بدر کے الفاظ میں حال یہ ہے کہ ؎

میری آنکھوں سے ترے پیار کا آنسو آئے
کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

مناسب ہوگا کہ آخر میں وہ مختصر تعزیتی تحریر بھی شامل کرلی جائے جو اماں کی وفات کے فوراً بعد "البدر" کے شمارہ اگست ۱۹۹۳ء میں راقم الحروف کے قلم سے شائع ہوئی تھی۔

"۱۸/ جولائی ۱۹۹۳ء کو اذان فجر کے وقت راقم الحروف کی نانی صاحبہ نے کم وبیش ۹۰/ سال کی عمر پاکر داعیٔ اجل کو لبیک کہا، پھر اس کے ایک ہفتہ بعد ہی ۲۵/ جولائی کو بنارس میں منجھلی پھوپھی صاحبہ کی وفات ہوگئی۔ اور ابھی پرسوں ۴/ اگست کو عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہٗ کی اہلیہ صاحبہ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

راقم الحروف سے جسمانی و جذباتی رشتوں کے علاوہ تینوں خواتین کچھ ایسی قابل تقلید خصوصیات کی حامل تھیں کہ ان کا مختصر ذکر قارئین کے لئے یقیناً فائدہ مند ہوگا۔

نانی صاحبہ مرحومہ نے آج کی اوسط عمر کے لحاظ سے طویل عمر پائی۔ اور گذشتہ کئی برسوں سے وہ اس حال میں تھیں کہ اعزاء ان کی جدائی کی خبر سننے کے لئے گویا تیار تھے، اس کے باوجود جس وقت ان کا جنازہ ہمارے گھر سے نکلا، ہر چھوٹے بڑے کی زبان

پر یہ حسرت آمیز بات تھی کہ بڑی خیر و برکت والی ذات رخصت ہوئی، نانی صاحبہ مرحومہ کی زندگی کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس دنیا کی عارضی زندگی کی محرومیوں کی تلافی فکر آخرت، یادِ الٰہی اور سجدہ ہائے بے قرار کی صورت میں کی، اور کسی محرومی کا کبھی گلہ وشکوہ نہیں کیا —— وہ بھری جوانی اور صرف ۱۹/ سال کی عمر میں اس طرح بیوہ ہوئیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کی اکلوتی یادگار میری والدہ ماجدہ تھیں، جن کی عمر اس وقت صرف ۳/ ماہ تھی ان کے والد صاحب چند سال اپنی اس بیوہ بیٹی کی سرپرستی کرنے کے بعد عالم فنا سے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے، اور پھر اس بھری دنیا میں دنیاوی رشتوں کے لحاظ سے ان کا کوئی عزیز ایسا نہ تھا کہ جوان کی فغان دل کو سن سکے، اور بہتے آنسوؤں کو پوچھ سکے۔

ان کی غیرت مند طبیعت نے دوسروں پر بوجھ بننے کے بجائے سلائی ٹکائی اور دوسرے ذرائع آمدنی سے اپنا اور اپنی یتیم بچی کا پیٹ بھرنا پسند کیا۔ اور جب خدا خدا کرکے ۱۴/ سال کی عمر میں ان کی بیٹی کا عقد والد ماجد مدظلہ سے ہوگیا تو جیسے ان کے سر سے بوجھ اتر گیا، اور انہوں نے اپنی ساری توانائیوں کا رخ اپنے مالک حقیقی کو راضی کرنے اور اپنی عاقبت سنوارنے کی طرف موڑ دیا۔

وہ نمازوں کی پابند ہی نہیں نمازوں کی عاشق تھیں، اور نماز کے ساتھ ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کی زندگی کی آخری رات میں جب کہ کئی دن سے ان کا بول بند تھا، لیکن احساس باقی تھا، جب راقم الحروف نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے نماز پڑھ

لی؟ تو اس کے جواب میں ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور جب راقم الحروف اور اس کی بڑی ہمشیرہ نے مل کر ان کے دونوں ہاتھ اٹھا کر نماز کی حالت کی طرح سینے پر رکھ دیئے تو ان کے ہونٹوں میں معمولی جنبش ہونے لگی، اور چہرہ پر طمانینت کے آثار صاف طور پر نظر آنے لگے۔ راقم الحروف نے اپنے بچپن ہی سے نماز اشراق، چاشت، اوابین، تہجد اور صلوٰۃ التسبیح کا ان کو اس قدر پابند پایا کہ بہت سے لوگوں کو فرض نمازوں کا بھی اس قدر اہتمام نہیں ہوتا۔ نماز مرحومہ کے لئے فریضہ کی ادائیگی سے بڑھ کر کیف وسرور کی چیز بن چکی تھی۔ اور وہ بڑے پر اعتماد لہجہ میں اکثر یہ شعر گنگنایا کرتی تھیں

ضائع نہ جائے گی کبھی محنت نماز کی
اللہ دینے والا ہے اجرت نماز کی......

نماز تہجد سے پہلے اور بعد کی ان کی آہ سحر گاہی نے نہ جانے کتنی مرتبہ گھر کے دیگر غفلت کوشوں کو اپنے مالک سے لو لگانے اور اپنے حال زار پر آنسو بہانے کے لئے مجبور کیا۔ راقم الحروف ان کا پہلا نواسہ اور اولاد نرینہ کی صورت میں پہلا فرد تھا۔ اس لئے فطری طور پر اس سے ان کو بے پناہ محبت تھی، ان کے پاس دنیا کا مال وزر نہ تھا جو دے سکتیں، لیکن اپنے اس ناقدرے نواسے کو انہوں نے ایسی ''سوغات'' بخشی، جس نے اس کے لئے کامیابی کی راہیں کھول دیں، کوئی چھوٹا بڑا تعلیمی امتحان ہو یا زندگی کا اور کوئی مشکل مرحلہ، جب راقم الحروف ان سے جا کر اپنی ''مشکل'' بیان کرتا۔ تو وہ بڑے پر اعتماد لہجہ میں کامیابی کی دعا دیتے ہوئے نماز شکرانہ مان لیتیں۔ اور پھر اس ''مشکل مہم''

پر روانگی کے وقت نماز حاجت کی نیت باندھ لیتیں۔ وہ نمازیں پڑھ پڑھ کر اسی سے مانگتیں جس کے پاس دینے کی اصل طاقت ہے، اور وہ ''داتا'' ان کی پُر کیف و پُر درد مانگوں کو پورا کرتا چلا جاتا۔ کیوں کہ دینے سے اس کے خزانے میں کمی نہیں واقع ہوتی۔

اس دنیا میں ہر آنے والے کو ایک نہ ایک دن جانا ہے، نانی صاحبہ بھی اپنی دنیاوی زندگی کی مدت پوری کر کے اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئیں، اور ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ وہ رحیم وکریم آقا اپنے گھر میں ان کے ساتھ اپنے شایان رحمت ہی معاملہ فرمائے گا۔ اور انشاء اللہ ان کے بے قرار جذبوں کو قرار مل چکا ہوگا۔ لیکن وہ ''سوغات' اب ہمیں کہاں سے ملے گی۔ جو صرف نانی صاحبہ ہی سے ملا کرتی تھی۔

سدا رہے نام اللہ کا''

ایک بھولے بسرے محسن کی یاد

گھر کے بغل میں جس مسجد میں ہم لوگ نماز پڑھتے ہیں، وہ پہلے تو بہت شکستہ حال اور غیر آباد تھی۔ پھر والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے بچوں کے ساتھ اس مکان میں رہنے کے ارادے سے کچھ مرمت کا کام شروع کرایا جو اس مسجد کے بغل میں تھا تو پہلے شکستہ حال مسجد کو اس قابل بنایا کہ اس میں نمازیں پڑھی جاسکیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی آبادی کا انتظام کیا۔ پھر دھیرے دھیرے آس پاس کے دو چار نمازی بھی آنے لگے، اور ماشاء اللہ مسجد میں اذان و جماعت کا نظام قائم ہوگیا۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ایک بزرگ، ضعیف العمر، خمیدہ کمر، اور سفید ریش میرے والد صاحب کے پاس آئے، میرے باہری کمرہ میں بہت دیر تک والد مرحوم کے ساتھ ان کی گفتگو ہوتی رہی۔ کبھی چائے کبھی پانی وغیرہ کے لئے کئی مرتبہ میں بھی وہاں گیا۔ مجھے یہ تو اندازہ نہیں ہوسکا کہ ان دونوں حضرات کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی ہے لیکن آتے جاتے میں نے ان بزرگ کو بہت بے قراری کے ساتھ روتے اور والد صاحب کو ڈھارس بندھاتے دیکھا تھا تو دل پر چوٹ لگی تھی اور یہ احساس ہوا تھا کہ یہ کوئی ستم رسیدہ اور دکھی آدمی ہیں۔

یہ میرے بچپن کی عمر تھی۔ نماز فرض تو نہیں ہوئی تھی لیکن گھریلو ماحول ونگرانی، خصوصاً والدہ مرحومہؒ کی ''کڑی نظروں'' سے ڈر کر نماز پڑھنا ہی پڑتی

تھی۔ پھر بھی موقع بہ موقع چھوڑ پکڑ بھی ہوجایا کرتی تھی۔ دن کی اکثر نمازیں مسجد ہی میں پڑھی جاتی تھیں، مسجد میں چوں کہ کوئی مستقل ومقرر امام ومؤذن نہیں تھے، کبھی والد صاحب کبھی دوسرے نمازی آکر اذان دیتے، تو دوچار نمازی جمع ہوکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیتے تھے۔ اسی لئے اذان و جماعت کے اوقات بھی مقرر نہیں تھے۔ یہ غالباً ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہمارے محلّہ کی آبادی آج کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اور مسجدیں ماشاء اللہ اتنی ہی تعداد میں اس وقت بھی تھیں جتنی آج ہیں؟ اکثر مسجدوں میں امام/مؤذن مقرر تھے۔ لیکن گلی کوچہ کی کچھ چھوٹی مسجدیں ایسی بھی تھیں جن میں کوئی امام یا مؤذن مقرر نہیں تھے، ان ہی میں سے ایک مسجد وہ بھی تھی جو میرے مکان سے متصل تھی —— پھر ہوا یہ کہ وہی ''بزرگ'' جنہیں دوچار روز قبل میں نے پہلی مرتبہ اپنے گھر کے باہری کمرہ میں والد صاحب سے باتیں کرتے دیکھا تھا، مجھے اسی مسجد میں نظر آنے لگے۔ اذان بھی دینے لگے، کبھی والد صاحب نہ ہوتے تو نماز بھی وہی پڑھا دیتے —— ایک دن دودن، پھر تو وہ اسی مسجد میں رات و دن رہنے لگے۔ اور گویا مسجد کے امام یا مؤذن مقرر ہوگئے۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں ایک بوسیدہ سے پلے لگی الماری تھی، اس الماری میں ان کا تالا لگ گیا، اور کئی مرتبہ یہ بھی نظر آیا کہ وہ الماری سے کپڑے کی بڑی سی پوٹلی نکالتے اور پھر اپنی ضرورت کی چیز اس میں سے نکال کر یا اس میں کوئی چیز رکھ کر پھر اسی طرح پوٹلی کو الماری میں بند کردیتے —— میری اس وقت کی معلومات کے مطابق بس یہی ایک پوٹلی ان کا کل اثاثہ تھی۔

وہ مسجد میں کبھی خالی نظر نہیں آتے تھے، میں جب بھی اپنے گھر سے ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان لے کر جاتا تو وہ نماز پڑھتے یا قرآن مجید کی تلاوت کرتے نظر آتے۔ وہ کافی ضعیف تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت بھی ان کی عمر اسّی برس سے کم نہ رہی ہوگی۔ کمر میں کچھ خمی آچکی تھی،

آنکھوں پر بہت موٹے شیشوں کا چشمہ اور منہ میں شاید دو تین ادھر ادھر کے
بڑے بڑے دانت تھے ـــــ اس کے باوجود آواز کافی بلند، چہرہ بہت
بارعب، اور مزاج میں کرختگی تھی۔ شروع شروع میں تو ان کے پاس جاتے اور
ان سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے ہر وقت
کے ساتھ پاس نے وہ جھجک ختم کر دی۔ میرے گھر اور گھر کے افراد سے ان کی
قربتیں بڑھتی گئیں اور وہ ہمیں اپنے گھر ہی کے ایک بزرگ فرد جیسے لگنے لگے
ـــــ اور اس رشتہ نے باقاعدگی اس وقت اختیار کر لی جب انہیں میرا ''کچا
پکا'' حفظ کیا ہوا قرآن مجید باقاعدہ سننے اور یاد کرانے کا ذمہ دار بنایا گیا۔ مدرسہ
کے اوقات تعلیم کے بعد میں ان کے پاس مسجد میں جاتا اور وہ میرے ساتھ
جٹ جاتے۔ چوں کہ وہ حافظ نہیں تھے اس لئے اپنے سامنے بھی قرآن مجید کا
دوسرا نسخہ رکھتے۔ پہلے ناظرہ کئی کئی مرتبہ پڑھواتے، پھر میں اپنے سامنے کا
قرآن مجید بند کر کے سناتا اور وہ اپنے سامنے کے نسخہ میں سنتے۔ ناظرہ بہت عمدہ
اور رواں تھا، میری کوئی غلطی چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی ایک پارہ یا اس سے
بھی کم کئی کئی قسطوں میں سنتے۔ میں تھک جاتا مگر وہ نہیں تھکتے تھے ـــــ یہ بھی
ہوتا کہ کبھی بہت دیر ہو جانے پر کچھ دیر کے لئے کھیلنے کودنے کی چھٹی دے کر
تاکید کے ساتھ وقت بتا کر دوبارہ واپسی کے لئے کہتے۔ پھر کبھی تو میں دوبارہ
پہنچ جاتا اور کبھی غائب رہتا تو وہ انتظار کر کے میرے گھر کے زینے چڑھ کر داخلی
دروازہ کے باہر کھڑے والدہ صاحبہ کو آواز دے کر کہتے ''ارے بہو، دیکھو وہ
عبدالعلی ابھی تک واپس نہیں آیا ہے اس کو بھیجو میں اسے لے کر جاؤں گا۔ اگر
کبھی میں آنا کانی کرتا اور وہ سن لیتے تو وہیں سے کہتے تم لوگ ذرا پردہ میں چلی
جاؤ، میں اسے پکڑ کر لے جاؤں گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان سے ''پیچھا
چھڑانے'' کے ہر جتن کرتا، گھر میں آکر ان کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے
گھر والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا، کبھی انہیں اس طرح

دوڑاتا کہ میں آگے بھاگتا اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے پیچھے پیچھے دوڑتے۔
انہوں نے نہ کبھی مجھے مارا، نہ ہی میرے پیچھے اپنے کو اس طرح بڑھاپے اور
ضعف کے عالم میں ہلکان کرنے کا کوئی معاوضہ لیا ـــــ لیکن میرا قرآن
ضرور یاد کرا دیا ـــــ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین)

(مولوی) رحمت اللہ نام کے ان بزرگ کے بارے میں جستہ جستہ کچھ
والد صاحب سے کچھ خود ان کی زبانی جو کچھ علم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی
مولوی نہیں بلکہ اس دور کے اچھے خاصے ''مسٹر'' کہلانے کے حق دار شخص تھے۔
کیوں کہ وہ اس دور کا ''ہائی اسکول'' پاس تھے جس کا مقابلہ آج کا ایم-اے
نہیں کر سکتا؟۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے جب انہیں سفید داڑھی، سر پر دو پلی
ٹوپی، اور لمبے کرتے کے ساتھ دیکھا تو ان پر ''مولوی'' سے زیادہ چسپاں ہونے
والا کوئی بھی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا تھا ـــــ پھر یوں بھی ''ہمارے عرف'' کے
مطابق، جس کی تعلیمی صلاحیت کے بارے میں کوئی معلومات نہ ہوں کہ وہ پڑھا
لکھا بھی ہے یا جاہل ہی ہے؟ اور اگر کچھ پڑھا ہے تو کہاں تک؟ اس کے
ڈاکٹر، حکیم، وکیل، انجینئر وغیرہ وغیرہ جیسی کسی ڈگری کے حامل ہونے کا بھی علم
نہ ہو ـــــ اور اتفاق سے اس کے سر پر ٹوپی اور چہرہ پر داڑھی ہو تو آسانی
کے ساتھ ''مولوی یا مولانا'' کہہ دیا جاتا ہے؟
بہ ہر حال ''مولوی'' رحمت اللہ نام کے ان بزرگ نے رہتے سہتے جب
ذرا ''پر پرزے نکالے''، تو علم ہوا کہ ان کی انگریزی زبان پر مہارت کی حد تک
گرفت ہے۔ وہ جب کبھی پڑھتے تو انگریزی اخبار ہی پڑھتے۔ گریجویشن اور
پوسٹ گریجویشن کے طالب علموں سے ملاقات ہو جاتی تو فوراً انگریزی میں
گفتگو شروع کر کے کچھ ہی دیر میں انہیں ''راہ فرار'' اختیار کرنے پر مجبور
کر دیتے۔ وہ نہ صرف زبان کو بولنے اور پڑھنے کی پوری قدرت رکھتے تھے بلکہ

انگریزی زبان کے قواعد (گرامر) پر بھی ان کی مضبوط پکڑ تھی۔ کچھ عرصہ کے
بعد مجھ سے بڑی بہن کو جو اس وقت اسکول کی درجہ ۴ر یا ۵ر کی طالبہ تھیں،
پڑھانے کے لئے میرے گھر آنے لگے۔ اور اپنے شوق سے میں بھی بہن کے
ساتھ ساتھ ان سے انگریزی پڑھنے لگا۔ چوں کہ انگریزی میں صرف اپنے شوق
وطلب کی وجہ سے ان سے اور ''صرف ان ہی سے'' پڑھتا تھا، اس لئے بہت جی
لگا کر پڑھتا تھا۔ مولوی رحمت اللہ صاحبؒ نے میرا ذوق وشوق دیکھ کر بہن سے
زیادہ مجھ پر توجہ شروع کردی۔ اس زمانہ کے معیاری اسکولوں میں پڑھائی
جانے والی کتاب Today and Tomorrow Reader کے چاروں
حصہ انہوں نے مجھے پڑھائے۔ انگریزی لکھنے کی مشق اس وقت اس کے لئے
استعمال ہونے والی G-Nib سے کرائی، اور مجھے اس لائق کردیا کہ میں نے ہائی
اسکول (Only English) کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کرلی۔

دھیرے دھیرے عمر بڑھنے کے ساتھ میرے شعور نے بھی ترقی کی، اور
میں نے ''شعوری آنکھوں'' سے دیکھا تو موصوف کو اپنا اور اپنے گھر کے تمام
افراد کا انتہائی مخلص پایا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے دو بیٹوں میں سے بڑے بہت
کامیاب تاجر اور صاحب ثروت ہیں، جب کہ چھوٹے بہت ہی غریب اور
لاولد ہیں۔ بڑے بیٹے نے مال و دولت کے نشہ میں باپ کے ساتھ ظالمانہ
برتاؤ کرتے ہوئے انہیں مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا، جب کہ چھوٹے بیٹے
کی تنگ دستی کی وجہ سے وہ ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے —— چوں کہ
میرے والد ماجد سے ان کے مراسم دیرینہ تھے، اس لئے ''پریشانی و بے
سروسامانی کے اس عالم'' میں وہ والد صاحبؒ سے ملے اور والد صاحب نے اپنا
دست تعاون بڑھا کر انہیں جینے کا حوصلہ دیا تھا۔ اس لئے وہ والد صاحب کو بیٹے
جیسا اور ان کی اولاد کو پوتوں پوتیوں جیسا پیار دے کر **ھل جزاء الاحسان
الا الاحسان** کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہوگئے تھے۔ وہ مزاج کے اکھڑ، صاف

گو، اور زبان کے تیز ضرور تھے۔ لیکن ان کا دل بہت صاف وشفاف تھا۔ بیٹے
کے مظالم نے انہیں بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا، جب کبھی اس بیٹے کا نام لیتے تو
............''ظالم'' کہہ کر لیتے، اور ان کے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ میری
والدہ اور سب سے بڑی بہن سے ان کا پردہ تو تھا مگر وہ دن بھر میں دو چار مرتبہ
پردہ کے پیچھے سے بات کرنے کے لئے ضرور آتے۔ میری والدہ کو وہ عموماً
''بہو'' کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ کبھی کبھی ''دلہن بہو'' بھی کہہ دیا کرتے
تھے۔ والد صاحب سے تو ان کے علم ومقام کا لحاظ کرتے ہوئے ذرا فاصلہ سے
اور بہت ضروری گفتگو ہی کرتے، لیکن والدہ صاحبہ اور ان کی اولاد، یا پھر کبھی کبھی
نانی صاحبہ سے ''اپنا دکھڑا'' بیان کرکے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتے تھے۔ وہ بہت ہی
خوددار، باوضع، تعلیم یافتہ، اور مہذب انسان تھے۔ میرے گھر کو انہوں نے اپنا
گھر ضرور بنا لیا تھا، مگر ایک ''چبھن'' تھی جو انہیں بے قرار رکھتی تھی۔ اور اپنے
برتاؤ اور حسن سلوک کے ذریعہ ''والد صاحب کے احسان'' کا بدلہ کچھ بڑھا چڑھا
کر ہی ادا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

آخر عمر میں جب وہ کافی بیمار اور ضعیف ہوچکے تھے، ان کے چھوٹے
بیٹے بہت اصرار کرکے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جہاں چند ہفتے ہی وہ قیام
کرسکے اور پھر اس فانی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون.**

مجھے یاد ہے کہ جب ان کے یہ بیٹے انہیں لینے کے لئے آئے تھے تو کئی
مرتبہ کی طرح پہلے انہوں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ پھر ان
کے رونے دھونے اور بہت اصرار پر یہ شرط رکھی تھی کہ ''ہمارے گھر والے،
خصوصاً والد صاحب خوشی خوشی اجازت دیں گے تب ہی جانا ہوگا'' —— اور
پھر جب وہ ہمارے گھر والوں کی ''اجازت'' سے ہم سے جدا ہوکر اپنے بیٹے
کے ساتھ جارہے تھے تو ان کی کیفیت ''زندہ لاش'' کی سی تھی؟ وہ خود بھی
زاروقطار رو رہے تھے اور ہم سب (جس میں خود والد صاحب اور گھر کی خواتین

بھی شامل تھیں) بھی انہیں رو رو کر اس طرح رخصت کر رہے تھے جیسے گھر سے
کوئی جنازہ جاتا ہے ـــــــ اور یہ سب کچھ غالباً اس لئے تھا کہ سب کو کچھ یقین
سا تھا کہ اب اس زندگی میں یہ ان سے آخری ملاقات ہے ـــــــ اور ہوا بھی
یہی۔ **فرحمة الله عليه رحمة واسعة۔**

مولوی رحمت اللہ مرحوم سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، انہیں میں نے
اپنے گھر آتے اور گھر کا ایک رکن بنتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔لیکن یہ ان کی
شخصیت کا کمال تھا کہ انہیں آسانی کے ساتھ گھر کے تمام افراد نے بڑا تسلیم کر لیا
اور انہوں نے اس بڑائی کو نباہ دیا۔

بچپن کی جس عمر میں ان کا ساتھ رہا وہ کچھ بہت زیادہ سوجھ بوجھ کی نہ
تھی۔اس لئے اس وقت تو بہت کم، لیکن جوں جوں عقل وشعور میں اضافہ ہوا،
مرحوم رحمت اللہ صاحبؒ کی قدر بڑھتی گئی۔ یقیناً انہوں نے میرا قرآن مجید یاد
کرانے میں بھی بڑی جاں فشانی کی۔ مجھے بہلا پھسلا کر بھی، ڈانٹ ڈپٹ کر
بھی، دوڑا دوڑا کر بھی، اور شکوہ شکایت کر کے بھی، پڑھنے اور یاد کرنے پر اس
طرح مجبور کیا کہ ان کی محنت اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں واقعی حافظ قرآن
ہو ہی گیا ـــــ لیکن انگریزی زبان میں جو کچھ مجھے ''شد بد'' حاصل ہوئی اسے
صرف اور صرف مولوی صاحب مرحوم کے احسان سے تعبیر کرنا لازم ہے۔ میں
نے انگریزی باقاعدہ کسی اسکول میں تو نہیں پڑھی، لیکن مولوی صاحب کے بعد
متعدد دیگر اساتذہ سے پڑھی اور ان سے اکتساب فیض کیا جن میں ایک نمایاں
نام شیخ مشیر حسین صاحب مرحوم مالک وکٹر آئس فیکٹری و یونائیٹڈ موٹر کمپنی لکھنؤ کا
بھی ہے۔اپنی نرالی شان وادا کے ''درویش رئیس'' بھی کیا خوب تھے؟ (ان کا
مختصر تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''یادوں کے جھروکوں سے'' میں کیا ہے) انہوں
نے خصوصی طور پر انگریزی اخبارات سامنے رکھ کر انہیں پڑھنے، اور خبروں کا

خلاصہ سمجھنے کا کچھ سلیقہ میری بساط کے مطابق سکھایا۔اسی طرح دیگر دو استاذوں
نے بھی اپنا اپنا تعاون عطا کر کے مجھے کسی قابل بنانے کی کوشش کی۔حق تعالیٰ
ان سب ہی کو اپنی طرف سے بہترین جزا عطا کرے۔(آمین)۔ـــــــ
تاہم اسے کیوں کر فراموش کر سکتا ہوں کہ اس زبان کو سیکھنے اور اس کی طرف اپنی
توجہ مبذول کرنے کا ''چسکہ'' تو مولوی رحمت اللہ مرحوم ہی نے ڈالا تھا؟، پھر
اپنی خداداد صلاحیتوں اور تعلیم و تربیت کے مخلصانہ انداز کے ذریعہ انگریزی
زبان وادب کو سیکھنے، اور اسے پڑھنے لکھنے کی جو ٹھوس اور مضبوط داغ بیل انہوں
نے ڈال دی تھی، اس سے حسب ضرورت ولیاقت ہمیشہ نفع حاصل ہوتا رہا۔ان
کے احسانات کا بدلہ تو کیا ہو؟ البتہ انہیں ''خراج عقیدت'' پیش کرتے ہوئے
اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

کون آیا راستے آئینہ خانے ہوگئے
رات روشن ہوگئی، دن بھی سہانے ہوگئے

میرے حافظ جی

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سب کے لئے ''قابل ذکر'' نہیں ہوتے۔
کیوں کہ دنیا میں ''قابل ذکر'' قرار دیئے جانے کی ظاہری علامتوں میں سے
کوئی علامت ان کے پاس نہیں ہوتی؟ اس کے باوجود ''کسی'' کے لئے وہ ایسے
ہوتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنے ہی نہیں بلکہ ''کرتے رہنے'' میں ایک خاص قسم کی
لذت اور فرحت ملتی ہے —— میرے حفظ کے استاذ حافظ سید علی صاحب
مرحوم کی حیثیت میرے لئے ایسی ہی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کئی ایسے مواقع
آئے کہ حافظ جی کے سلسلہ میں کچھ لکھنے اور ان کی ''خصوصی اداؤں'' کو بیان
کرنے کا تقاضا ہوا، مگر ہر مرتبہ یہ سوچ کر نہ لکھنے ہی کا فیصلہ کیا کہ لکھا جاتا ہے
اس لئے کہ اسے پڑھا جائے —— اور پڑھنے والا اسی تحریر پر اپنا وقت خرچ
کرتا ہے جس میں اس کے لئے اپنی دلچسپی کا کوئی سامان ہو؟ ان دنوں رمضان
کا مبارک مہینہ چل رہا ہے، اور ''لاک ڈاؤن'' نے ایسی وافر فرصت دے رکھی
ہے کہ اس کا استعمال بھی بجائے خود ''ذوق کی آزمائش'' ہے؟ حالات کچھ ایسے
ہیں کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ قید و بند کے ''اس جبر'' سے کب نجات ملے گی؟ اور
اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ اگر اس حیات مستعار میں اس جبر سے کبھی نجات مل
بھی گئی تو ذہن وفکر کی صلاحیتیں اور کاغذ و قلم سے رشتہ کی یہ خداداد نعمت بھی باقی

رہ سکے گی یا نہیں؟ ایسے میں شدید تقاضا ہوا کہ ''اپنے حافظ جی'' کے بارے میں
کچھ لکھ کر اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے اپنے قارئین سے دست بستہ یہ
گذارش کر لی جائے کہ۔

سن لیجئے فرصت ہے، پھر کیا ہو خدا جانے
کب سے ہیں مرے دل میں بے تاب کچھ افسانے

تو بات کا آغاز یہاں سے کہ میری عمر اس وقت کم و بیش ۶/ برس رہی
ہوگی، میری پہلی درسگاہ مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ میں حافظ سید علی صاحب اس
وقت درجہ ناظرہ کے استاذ تھے، لیکن حفظ کرنے والے کئی بچوں کو وہ ٹیوشن کے
طور پر پڑھاتے بھی تھے، اور ان کی اس سلسلہ میں بڑی شہرت تھی کہ ان سے
پڑھنے والے بچے بڑے ہونہار ہوتے ہیں۔ کچھ اپنے رعب و دبدبہ سے، کچھ
پیار و محبت سے، اور سب سے بڑھ کر خداداد صلاحیت سے وہ حفظ کے ابتدائی
بچوں میں ایسا ذوق پیدا کر دیتے ہیں کہ بچہ بس پڑھنے ہی لگتا ہے۔ ایک دن
میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ مجھے لے کر حافظ جی کے پاس
مدرسہ ہی میں گئے اور ان سے مجھے ٹیوشن میں پڑھانے کی درخواست کی۔ حافظ
جی سے والد صاحب کے پہلے سے ''ذرا دوسری نوعیت کے'' تعلقات تھے
—— جس کی تفصیل یہ ہے کہ میرے حافظ جی پہلے پیشہ ور موٹر ڈرائیور کی
حیثیت سے شہر کے اس وقت کے ایک رئیس شیخ محمد مستنصر اللہ کے یہاں
ملازمت کرتے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم کا ہمارے خاندانی بزرگوں سے گہرا
عقیدت مندانہ و باضابطہ رشتہ تھا —— یہ ان دنوں کی بات ہے جب کار کے
مالک چند اِنے گنے لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ خود گاڑی ڈرائیو کرنے کا چلن نہیں
تھا، بلکہ اس کے لئے گاڑی کے مالک کو ڈرائیور کی خدمات حاصل کرنا پڑتی
تھیں۔ شیخ صاحب شہر لکھنؤ کے ان چند مسلم رئیسوں میں سے تھے جو گاڑی اور

اس کے ڈرائیور کا بار اٹھا سکتے تھے۔ میرے والد صاحب کئی مرتبہ ضرورت پیش آنے پر شیخ صاحب کی اس کار پر سفر کر چکے تھے جس کے ڈرائیور ہمارے حافظ جی ہی تھے —— مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے حافظ جی نے اسی حوالہ سے والد صاحب سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں آپ کے بچہ کو نہیں پڑھا سکتا ہوں کیوں کہ میں تو آپ کا ڈرائیور رہا ہوں۔ والد صاحب نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ اس کی تفصیل تو مجھے نہ یاد ہے نہ اسے پوری طرح سمجھنے کی وہ عمر تھی۔ تاہم والد صاحب نے کچھ ایسی بات چیت ضرور کی کہ حافظ جی نے میرے گھر آکر مجھے پڑھانے کی منظوری دے دی۔ اور اس کے دوسرے ہی دن سے انہوں نے آنا بھی شروع کر دیا۔

گھر سے بالکل متصل مسجد میں (جس کا نام اب مسجد بلالی ہو چکا ہے) حافظ جی نے مجھے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ خود کوئی سبق نہیں دیتے تھے، بلکہ مدرسہ میں ملا ہوا سبق یاد کراتے، البتہ سبق کا پارہ اور آموختہ اپنے حساب سے اور اپنی نگرانی میں یاد کراتے اور سنتے تھے۔ دو ہی چار روز کے بعد ایک ایک کر کے کچھ اور بچے بھی آنے لگے اور دھیرے دھیرے یہ ہمارا ایک مکتب بن گیا۔ اپنے مدرسہ کے ساتھی ظفر الحق تو حفظ ہی کے لئے آتے تھے، باقی ناظرہ کے لئے آنے والوں میں محمد زاہد، محمد سبحان اور محمد سلطان کے نام یاد ہیں بلکہ اب سب ہی سے کسی نہ کسی درجہ کے مراسم بھی قائم رہے۔

مدرسہ میں چھٹی کے بعد حافظ جی ظفر کے گھر پڑھانے جاتے تھے، جہاں ان کی دو چھوٹی بہنیں بھی ناظرہ پڑھتی تھیں، پھر میرے یہاں آتے اور ظفر کے لئے حکم ہوتا کہ کھانا کھا کر میرے یہاں مسجد آجائیں۔ اس طرح ہم دونوں حفظ کے ساتھی مسجد میں بھی پڑھتے تھے —— آخر میں جب ہمارے حفظ کی تکمیل ہونے والی تھی تو حافظ جی ہم لوگوں کو ٹیوشن کے بعد اپنے گھر بھی لے

جانے لگے تھے۔ حافظ جی لاولد تھے۔ وہ ہم شاگردوں ہی کو اولاد جیسا پیار کرتے تھے۔ پڑھائی کے سلسلہ میں تو ان کے یہاں ''رعایت'' کا کوئی خانہ نہیں تھا، اور بوقت ضرورت اس کے لئے وہ ہماری ''مناسب سے بڑھ کر'' بھی ''خاطر مدارات'' کیا کرتے تھے۔ ان کی ''چٹکیوں اور ضربات'' کی یادگاریں میری جانگھ اور جسم کے دوسرے حصوں پر عرصہ دراز تک باقی رہیں۔؟ لیکن پڑھائی کے بعد چھٹی کے وقت خصوصاً بعد نماز مغرب بڑے چاؤ چونچلوں سے ہم لوگوں کو خوب خوب کھلاتے پلاتے اور اپنا پیار دیتے کہ ہم لوگ ان کی ''دوسری والی خاطر مدارات'' بھول جاتے۔ وہ استانی جی سے ہمارے لئے چائے، دہی بڑے، کباب اور نہ جانے کیا کیا پکوان بنواتے۔ اور بڑے اعتماد کے ساتھ ان سے یہ کہتے کہ یہ ہمارے بچے ہیں، ان کو کبھی دوبھر نہ کرنا۔ میرے مرنے کے بعد یہی بچے تمہارے کام آئیں گے۔ تم انہیں اولاد والا پیار دو گی تو یہ بھی تمہارے ساتھ ماں والا سلوک کرنے پر مجبور ہوں گے۔

حافظ جی کے انتقال کے بعد ہماری استانی جی کافی عرصہ تک زندہ رہیں۔ میرا ان کے گھر آنا جانا بھی رہا۔ وہ مجھ سے بہ ظاہر خوش بھی رہیں —— لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف ہے کہ حافظ جی کے احسانات کا میں حق نہیں ادا کر سکا۔ ان کے احسانات کا پورا صلہ تو ان شاء اللہ انہیں اپنے اس رحیم و کریم پروردگار ہی سے ملے گا جس کی رضا و خوشنودی کے لئے انہوں نے تا عمر قرآن مجید اور اس کے طالب علموں کی بے لوث خدمت کی —— میری سرخ روئی کے لئے تو یہی کافی ہوگا کہ میری استانی جی یہ کہہ دیں کہ اس سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ حافظ جی مسرت کے ساتھ میرا ہاتھ تھام کر شاباشی دے دیں۔ اور رب العالمین انہیں شاداں وفرحاں دیکھ کر میرے ساتھ اپنے خصوصی کرم کا معاملہ کر دیں۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز.**

مدرسہ تجوید الفرقان میں میرے درجہ کے استاذ پہلے قاری محمد مظفر صاحب، پھران کی وفات کے بعد قاری محمد حیدر صاحب رہے، اوران ہی کے درجہ سے میری حفظ قرآن کی دستار بندی بھی اس وقت ہوئی جب میری عمر پورے دس برس کی بھی نہیں تھی۔ حافظ جی اس وقت اوراس کے بعد بھی کافی عرصہ تک مدرسہ میں درجہ ناظرہ ہی کے استاذ رہے، پھروہ اسی مدرسہ میں حفظ کے استاذ بھی ہوگئے۔ جہاں ان سے میرے چھوٹے بھائی عبدالولی اورمیرے عزیز بھانجہ عبدالمنان مرحوم نے حفظ کی تعلیم حاصل کی۔

حافظ جی مدرسہ میں جب درجہ حفظ کے استاذ مقرر ہوئے، اس وقت ان کی عمربھی یقینی طور پرساٹھ برس سے تجاوز کرچکی تھی اور علیل بھی رہنے لگے تھے۔ اس لئے وہ میرے دوروالی گھن گرج باقی نہیں رہی تھی ـــــ یہ الگ بات ہے کہ شیر بوڑھا اور بیمار ہوجانے کے بعد بھی شیر ہی رہتا ہے، اوراس کا ''شاہی رعب وبدبہ'' باقی رہتا ہے؟۔

بھائی اور بھانجہ کا حال چال لینے، اوراپنے حافظ جی کی دعائیں حاصل کرنے کے لئے میرا اس وقت تک برابر آنا جانا رہا جب تک میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔ پھر جب حصول تعلیم کے لئے بہرائچ اور دیوبند میں قیام ہوا تو حاضری بہت کم ہوگئی، البتہ جب لکھنؤ آنا ہوتا تو کم ازکم ایک مرتبہ تو حافظ جی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ اس دوران ہرملاقات میں یہ دیکھ کر بہت قلق ہوتا کہ حافظ جی کی صحت دن بہ دن گرتی جارہی ہے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند سے چھٹیوں میں میری لکھنؤ واپسی ہوئی تو میں ''بڑے اہتمام کے ساتھ'' خوشی خوشی ملاقات کے لئے حافظ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنے حافظ جی کو دیکھ کراوران سے مل کر میری ساری خوشیاں کافور ہوگئیں۔ مجھے اپنے حافظ جی کے کینسر جیسے موذی ومہلک مرض میں مبتلا ہوجانے

کی اطلاع تو پہلے ہی مل چکی تھی، مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مرض اس حدتک بڑھ چکا ہوگا؟۔ حافظ جی شدید تکلیف میں مبتلا تھے، ان کی حلق سے آواز کافی مشقت کے بعد بھی بہت آہستہ نکل رہی تھی ـــــ اس کے باوجود وہ مدرسہ کی پابندی کرر ہے تھے ـــــ جسے ان کی ''مجبوری'' کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا؟

مجھے دیکھ کر حافظ جی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرآئے ـــــ ان کا بوجھ کچھ ہلکا کرکے انہیں خوش کرنے کے لئے دلاسہ وتسلی دیتے ہوئے اپنی دارالعلوم دیوبند سے تکمیل نصاب کے بعد واپسی کی اطلاع دی تو اچانک ان کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ انہوں نے بڑے چاؤ کے ساتھ مجھے گلے لگاتے ہوئے اپنے پاس اپنی دری پر بٹھانے کی کوشش کی تو میں نے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ یہ آپ کی مسند ہے۔ میں تو اپنی جگہ ہی بیٹھوں گا۔ حافظ جی نے اس تکلیف کے عالم میں بھی میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ''نہیں، اب تو تم عالم بن گئے ہو'' جواب میں میرے منہ سے یہ نکلا کہ ''میں کچھ بھی ہوجاؤں، لیکن میری جگہ آپ کے قدموں میں ہی رہے گی'' ـــــ تو میرے حافظ جی اس طرح پھپھک کررو پڑے جیسے ان کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں؟ وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر دیر تک خود بھی روتے رہے اور مجھے بھی رلاتے رہے۔ وہ مجھے منھ بھربھر دعائیں دیتے رہے، اور میں ان کی ہر دعا پر ''آمین'' کہتا رہا ـــــ ابھی جذبات کا یہ سیل رواں کچھ تھما ہی تھا کہ حافظ جی نے قریب ہی بیٹھے میرے بھانجہ عبدالمنان مرحوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو اب میرے درجہ سے ہٹالو! اور جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو حافظ جی نے بڑی بے بسی کے ساتھ اتنا کہا کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ میرا قرآن یاد نہیں رہا'' ـــــ اور پھر سامنے ڈسک پر رکھے کھلے قرآن مجید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''دیکھ نہیں رہے ہو کہ اب میں قرآن میں دیکھ

کرسنتا ہوں، تم لوگوں کے وقت میں تو ایسا نہیں تھا؟'' میں نے سمجھ لیا کہ میرے حافظ جی مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے اپنا درددل اپنے ایک ادنیٰ شاگرد یعنی ''اپنے روحانی بیٹے'' کے سامنے بیان کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ۔

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے
مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے

ایک ڈھاڑیں مارتے شیر کو بے بسی کے ساتھ پنجڑے میں قید ہو کر تڑپتے اور پھڑکتے دیکھ کر مرے دل پر جو گذرنا تھی گذر گئی —— دنیا کی ناقدری، اور بدنصیبوں وکم ظرفوں کی ریشہ دوانیوں وایذاؤں کے حوالہ سے اپنے حافظ جی کو جس طرح مجھ سے بن پڑا، میں نے دلاسہ دیتے ہوئے جب ان سے یہ کہا کہ ''آپ کا اصل معاملہ اپنے اللہ سے ہے، جس کے کلام کی خدمت میں آپ نے اپنی پوری عمر لگائی۔ اوراس کا ثمرہ مجھ جیسے آپ کے سیکڑوں شاگرد ہیں جوان شاءاللہ آپ کے لئے ذخیرۂ آخرت بنیں گے۔ دنیا کے ان حاسدوں کی آپ کو کوئی فکر نہیں کرنا چاہئے ....'' تو ایسا لگا کہ میرے حافظ جی کو جیسے قرار آ گیا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے بس اتنا کہا کہ ''میری زندگی ہی کتنے دن کی ہے؟'' —— اور میں خاموش رہ گیا —— اور پھر کچھ ہی عرصہ گذرنے کے بعد میرے حافظ جی اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر عالم باقی کی طرف منتقل ہو گئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

حافظ جی کی وفات کی صحیح تاریخ تو مجھے بھی یاد نہیں رہ گئی، کیوں کہ ان کی وفات پر کم وبیش نصف صدی کا عرصہ گذر گیا ہے —— اور اتنی مدت تک کون کس کو یاد رکھتا ہے؟ پھر حافظ جی کے تو کوئی اولاد بھی نہ تھی کہ نسبی سلسلہ سے ہی ان کا نام چلتا —— لیکن یہ قرآن ہی کا فیض ہے کہ کسی نہ کسی حوالہ سے آج بھی ان کے ہم بچے کھچے شاگردوں کے درمیان ان کا ''ذکر خیر'' ہو ہی جاتا

ہے، اوران کے لئے دعائے مغفرت کی توفیق بھی مل جاتی ہے۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں کروٹ کروٹ آرام عطا فرمائے، اوران کی دنیا کی محرومیوں کی بھرپور تلافی اپنے شایان کرم انعام واکرام کے ساتھ فرمائے۔ (آمین) ع

جانے والا گیا داستاں رہ گئی

◦◦◦◦◦ ——— ✿ ——— ◦◦◦◦◦

حکیم الاسلام کے
خانوادۂ فاروقی سے روابط

(۱۵ر تا ۱۷ر نومبر ۲۰۰۶ء دیوبند میں منعقد ہونے والے حکیم الاسلام سمینار کے لئے یہ مقالہ ارتجالاً لکھا گیا جو سمینار کی تیسری نشست میں ۱۶ر نومبر ۲۰۰۶ء کو پیش کیا گیا۔............مدیر)

رب کائنات کے اس انعام کی شکرگذاری کے لئے زبان وقلم میں سکت نہیں کہ اس نے ایک ایسے خانوادہ کا فرد بنا کر اس عالم رنگ وبو میں بھیجا جہاں علمی ودینی شخصیات سے ربط وتعلق کے لئے خاندانی نسبت ہی کافی تھی، اور اب آباء واجداد کی نسبت سے اس ''حلال کمائی'' کا کیوں نہ ذکر کروں کہ اس بے سواد راقم الحروف نے گھر بیٹھے ہی وقت کی ایسی ایسی اہم اور جلیل القدر شخصیات کی زیارت اور جوتیاں سیدھی کرنے کی سعادت حاصل کرلی جن کی ایک جھلک پانے کے لئے ''باتوفیق'' لوگوں کو نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے تھے؟ و ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

ان مقتدر شخصیات میں ایک نمایاں نام حضرت حکیم الاسلامؒ مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے — جن کی زیارت، اور بار بار زیارت

''حد شعور'' میں داخل ہونے سے کتنا پہلے ہوچکی تھی؟ یہ یاد نہیں! ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ اس وقت بھی ان کا اجلا اجلا سراپا، ان کا روشن روشن چہرہ، ان کا نرم نرم لہجہ، اور ان کی تبسم برلب گفتگو اتنی اچھی لگتی تھی کہ بے ساختہ ان جیسا بن جانے کی ''طفلانہ تمنائیں'' مچلنے لگتی تھیں — اور پھر سن شعور تک پہنچنے پر ان تمناؤں نے یہ تعبیر اختیار کرلی کہ — اگر ''اجالوں کے سفیر'' مذہب اسلام کو عالم مثال میں جسمانیت عطا کی جائے تو وہ مجسم ہوکر وہی ہوگا جسے ہم ''حکیم الاسلام'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

بلاشبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ایک بلند پایہ خطیب تھے، بے مثال منتظم تھے، متکلم اسلام تھے، عظیم المرتبت مرشد تھے، سرمایہ اسلاف کے جامع تھے، مقبول ترین استاذ تھے، دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم کے مؤثر ترین ترجمان تھے، کشتی ملت کے قابل اعتماد ناخدا تھے، صاحب طرز ادیب ومصنف تھے، اور اپنے لب ولہجہ، اثر ونفوذ، اخلاق وکردار، اور حسن ظاہر وباطن کے لحاظ سے ہماری اس زمین پر حق کی ایک چلتی پھرتی، مسکراتی بولتی نشانی تھے — اور ان کی کتاب زندگی کے ان حسین عنوانوں کا اجاگر ہونا اخلاف کے لئے ضروری بھی ہے اور محسن شناسی کا تقاضا بھی — تاہم راقم الحروف نے ان سب سے ہٹ کر جو عنوان اختیار کیا ہے اس کے ذریعہ اپنی ''تہی مائیگی'' کے اعتراف کے ساتھ ہی حکیم الاسلام کی نسبتوں کی قدردانی اور انداز خردنوازی کی ایک جھلک دکھانا بھی مقصود ہے۔

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ اور ان کے برادر خرد جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم فاروقیؒ سے حکیم الاسلامؒ کے برادرانہ رشتے اور ربط باہمی کی تفصیلات پیش کرنے سے تو راقم الحروف عاجز ہے — ہاں حکیم الاسلام کے وہ تعزیتی خطوط پیش نظر ہیں جو ان دونوں بزرگوں کی وفات کے موقع پر ان کے ورثاء کے نام بھیجے گئے۔

دسمبر ۱۹۵۶ء میں جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ کی وفات کے موقع پر ان کے برادر اکبر امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحبؒ کے نام ایک، اور صاجزادۂ گرامی حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ کے نام یکے بعد دیگر بھیجے گئے دو خطوں میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے نہ صرف اپنے گہرے ربط و تعلق کے ساتھ صدمہ کا اظہار فرمایا ہے، بلکہ حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحبؒ کی جلالت علم، اور اخلاق و تواضع کا جس والہانہ و غیر رسمی انداز میں ذکر فرمایا ہے اس سے ہم خردوں کو اپنے جد امجدؒ کے مرتبہ و مقام کو سمجھنے میں بھی بہت کچھ رہنمائی ملی۔

اسی طرح اپریل ۱۹۶۲ء میں امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی وفات کے موقع پر حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے تعزیتی خط میں، اور پھر وفات کے بعد ان کے قائم فرمودہ ''شہدائے اسلام'' کے سالانہ جلسوں میں پہلی تشریف آوری میں دوران تقریر حضرت امام اہل سنتؒ کے سانحۂ وفات پر اپنے جس گہرے قلق اور فکرمندی کا اظہار فرمایا، اس کا لفظ لفظ درد و محبت میں ڈوبا اور ہر قسم کے تکلف و تصنع سے پاک تھا، اور اس کی تاثیر ''از دل خیزد بر دل ریزد'' والی تھی۔

۱۹۶۲ء تک چونکہ راقم الحروف سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا اس لئے خانوادۂ فاروقی کے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ حضرت حکیم الاسلامؒ کے روابط کے شعوری مشاہدہ و حفظ کے لائق نہ تھا — البتہ ان کے اخلاف اور اپنے بزرگوں سے اس سلسلہ میں جو کچھ سنا اور اس خانوادہ کے سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کی جن مراعات کا مشاہدہ کیا وہ بے غرض اور گہرے دینی رشتہ کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

(۱) امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ کے قائم فرمودہ لکھنؤ کے تاریخی پندرہ روزہ جلسہ ہائے ''شہدائے اسلام'' میں ہر سال کسی

ایک روز حضرت حکیم الاسلام نے شرکت اور اپنی گہربار تقریر کو لازمی رکھا، حتیٰ کہ آخر کے دور ضعف و نقاہت میں جب کہ اطباء کے مشورہ پر رات کے جلسوں میں شرکت موقوف فرمادی تھی۔ قدیم ربط و تعلق اور وضع داری کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے ناغہ نہ فرما کر تشریف لائے اور باشندگان لکھنؤ کو دن کی ایک پر ہجوم خصوصی نشست میں اپنے ارشادات عالیہ سے مستفید فرماتے ہوئے اصلاح عقائد کے سلسلہ میں ان تاریخی جلسوں کے خصوصی کردار، جلسوں کے بانیان اور اس وقت کے منتظمین سے اپنے خصوصی ربط و رشتہ کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

(۲) حج بیت اللہ کے لئے خانوادۂ فاروقی کے متعدد افراد، اور حکیم الاسلامؒ ایک ہی بحری جہاز میں سفر کر رہے تھے، دوسری طرف اسی جہاز میں بریلوی مسلک کے مشہور جارح مقرر و مناظر مولوی حشمت علی بھی ہم سفر تھے اور اپنی عادت کے مطابق موقع بہ موقع جراحت پاشی کرتے جا رہے تھے۔ ان کے لئے یہ منظر ہی کیا کم روح فرسا تھا کہ حضرت امام اہل سنتؒ، حضرت جامع العلومؒ، حضرت حکیم الاسلامؒ، اور خانوادۂ فاروقی کے دیگر علماء کے علاوہ متعدد علمائے حق، ایک ساتھ اسی جہاز میں سوار ہو کر زیارت حرمین کے لئے جا رہے تھے جس میں سوار ہو کر سفر کرنا آں موصوف کی بھی مجبوری تھی؟ چنانچہ بحری جہاز کے اس طویل سفر میں آتے جاتے، چلتے پھرتے وہ ہمارے علمائے حق کو دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق کوئی نہ کوئی فقرہ کس دیتے، اور اپنے لئے نشاط روح کا سامان فراہم کر لیتے — خصوصاً حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر وہ بلند آواز میں **یا رسول اللہ** کہہ کر اپنے خیال کے مطابق ''فریضۂ حق'' ادا کرنا نہیں بھولتے تھے۔

امام اہل سنتؒ کے فرزند اور حکیم الاسلامؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقیؒ نے کئی مرتبہ چھیڑ چھاڑ دیکھ کر آخر اپنے استاذ محترم سے

اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ حضرت! یا تو آپ خود ان کی ''زبان بندی'' کا انتظام کیجئے یا پھر مجھے جواب دینے کی اجازت دیجئے؟ حکیم الاسلامؒ اس وقت تو مسکرا کر خاموش ہوگئے — لیکن اگلے موقع پر جہاز کی بالائی منزل سے اترتے ہوئے حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر جب مولوی صاحب موصوف نے **یا رسول اللہ** کا نعرہ بلند کیا تو حکیم الاسلام نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ برجستہ فرمایا **انی لست برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** (میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوں) اس برجستہ اور حکیمانہ جواب نے مولوی صاحب کی بولتی بند کردی اور پھر وہ پورے سفر کے دوران نظریں بچا کر گذر جانے ہی میں عافیت سمجھتے رہے۔

(۳) خانوادۂ فاروقی کے ایک فرد کی حیثیت سے خود راقم الحروف بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی شفقتوں وعنایتوں سے خوب مالا مال ہوا۔ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ طالب علمی (۹۰-۱۳۸۷ھ) کے قیام کے دوران ''طیب منزل'' کی عصر بعد کی مجلس میں برابر حاضری ہوتی۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اپنی مادر علمی کے سربراہ اعلیٰ کی خدمت میں اپنی غرض لے کر بھی کبھی کبھی حاضری ہوتی — اور اپنے فخر واعزاز کے لئے بس یہی کیا کم تھا کہ ہزاروں طلبہ کے درمیان حضرت حکیم الاسلام مجھے بھی پہچانتے تھے — اور اس پہچان سے فائدہ اٹھانے کا ایک واقعہ اس وقت بھی یاد آرہا ہے کہ اپنے ایک ساتھی کو (جو غریب اور غیر مستطیع تھے اور ایک کتاب میں نمبر کم آنے کی وجہ سے ان کی امداد موقوف ہوگئی تھی) لے کر ایک ''خاص اعتماد وزعم'' کے ساتھ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں حاضر ہوا، اور امداد جاری کئے جانے کے سلسلہ میں پہلے سے لکھی ہوئی درخواست حضرت والا کی خدمت میں پیش کردی —— حضرت والا نے درخواست دیکھ کر فرمایا کہ یہ تو ایک کتاب میں فیل ہیں، ضابطہ کے مطابق ان کا کھانا جاری نہیں رہ سکتا۔

میں نے ''پہچان کے اسی نشہ'' میں عرض کردیا، لیکن حضرت! آپ کو پچاس طلبہ کا کھانا جاری کرنے کا خصوصی اختیار بھی تو ہے؟ جواب میں حضرت والا نے مسکراتے ہوئے فرمایا، اچھا آپ لوگوں کو اس کا بھی علم ہے — اور پھر خانوادۂ فاروقی کے اس ایک ادنیٰ طالب علم کی لاج رکھتے ہوئے درخواست پر کھانا جاری کئے جانے کا حکم تحریر فرمادیا — نہ خوشامد کرائی، نہ سفارش طلب کی، نہ ہی معاملہ کو التوا میں ڈالا — تو پھر اسے خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلام کے خصوصی ربط وتعلق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

(۴) ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام وتشکیل کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے ''بمبئی کنونشن'' کا دعوت نامہ علمائے دارالمبلغین کے نام بھی آیا۔ اس وقت کی ''خاص مصلحتوں'' کی وجہ سے اس کنونشن اور مجوزہ بورڈ میں شرکت کا دعوت نامہ علمائے شیعہ کو بھی دیا گیا تھا، علمائے دارالمبلغین کو اس کا علم ہوا تو خانوادۂ فاروقی کے اس وقت کے سربراہ حضرت مولانا عبدالسلام فاروقیؒ نے حکیم الاسلامؒ کو خط لکھ کر اس کنونشن میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی شرکت سے معذرت کرلی۔

اس کنونشن میں شرکت کرنے والوں اور شرکت کی خواہش رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی، نہ ہی چند علمائے دارالمبلغین کے شریک نہ ہونے سے کنونشن کی ناکامی کا کوئی اندیشہ تھا — تاہم یہ حکیم الاسلام کی قدر افزائی اور خانوادۂ فاروقی سے خصوصی ربط کی بات ہے کہ حکیم الاسلام دیوبند سے سفر کر کے لکھنؤ تشریف لائے، اور اپنے خردوں کے سامنے ان کے موقف کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے ''مصلحت وقت'' کے پیش نظر کنونشن میں ان کی شرکت پر اصرار فرمایا، اور یہاں تک فرمایا کہ حضرت امام اہلسنتؒ، ان کے رفقاء اور اخلاف نے مسلمانوں کو ایک ''فکر صالح'' عطا کی ہے — جس کے اعتراف میں آپ حضرات کی اس کنونشن میں شرکت کو میں ضروری سمجھتا ہوں، اور آپ حضرات کی عدم شرکت

سے اس کنونشن میں مسلمانوں کے ایک ''صالح مکتب فکر'' کی کمی محسوس کی جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی اس قدر افزائی، اور پاس ربط وتعلق کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا کہ پھر خانوادۂ فاروقی سے حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد عبدالحلیم فاروقی صاحبؒ، اور دارالمبلغین کے استاذ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ نے اس کنونشن میں شرکت کی۔

(۵) اور خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلام کے گہرے ربط ورشتہ کا برملا اظہار تو اس وقت ہوا جب ۱۳۸۹ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ لکھنؤ کے ایک رئیس کی خصوصی دعوت پر تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد عبدالحلیم فاروقی صاحبؒ کی اس درخواست کو شرف قبول بخشا کہ قصبہ کاکوری میں ان کے قائم کئے ہوئے نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ تشریف لے جا کر ادارہ کی ترقی وقبولیت کے لئے دعا فرمادیں۔ بعد نماز عصر کا وقت طے ہوا اور حضرت والا نے از راہ شفقت اپنے میزبان پر اعتماد کرتے ہوئے مولانا محمد عبدالحلیم صاحب سے فرمادیا کہ آپ کاکوری پہنچیں، میں انشاء اللہ مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا—— اور پھر جب کاکوری کے لئے روانگی کا وقت آیا تو ''کچھ یاران ستم پیشہ'' نے سواری، ڈرائیور، اور راستہ کی خرابی کے حوالوں سے حضرت والا کے خیر سے دارالعلوم فاروقیہ اور قصبہ کاکوری کو محروم کردینے کی تدبیریں کیں —— حضرت والا نے اس سازش کو بھانپتے ہوئے اپنے ''عمومی مزاج'' کے خلاف سخت رخ اختیار کرتے ہوئے صاف فرمادیا کہ ''یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی پروگرام میں شرکت کے بغیر میں یہیں سے دیوبند واپس چلا جاؤں، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میں یہاں رہ کر کاکوری نہ جاؤں، اور مولانا محمد عبدالحلیم صاحب کی دل شکنی کروں'' اور پھر تمام راہیں آسان ہوگئیں اور حکیم الاسلام اپنے وعدہ کے مطابق کاکوری پہنچے اور مدرسہ میں چند منٹ ٹھہرے اور دعا کرانے کے بعد واپس

تشریف لائے۔

یہ وہ چند واقعات ومشاہدات ہیں جن سے خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلامؒ کے اس ربط کا اظہار ہوتا ہے جس کے ذریعہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذاتی جواہر، اخلاقی کمالات، دین اور اہل دین سے الفت، مرتبہ شناسی، اور خردنوازی کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہیں۔

خدا حافظ ـــــ امّی

دو کلموں کا یہ مرکب ''خدا حافظ'' اپنی امی (والدہ صاحبہ مرحومہ) کی زبان سے تو نہ جانے کتنی مرتبہ سنا؟ ہر جدائی کے وقت ـــــ چاہے وہ کسی سفر میں جاتے وقت ہو، گھر سے مدرسہ آتے وقت ہو، یا پھر شہر ہی میں کہیں جاتے ہوئے ہو ـــــ لیکن یکم دسمبر ۲۰۱۴ء کو اپنی سفید پوش امی کو ان کے اس دنیا کے آخری سفر پر روانہ کرتے ہوئے میں نے انہیں خدا حافظ کہا، اور پھر جب انہیں قبر کی گود کے حوالہ کرتے ہوئے ''خدا حافظ ـــــ امی'' کہا تو اگر ایک طرف اپنے رب کریم کی رحمت بے پایاں پر بھروسہ تھا، تو دوسری طرف کتنی ہی مختصر مدت کے لئے سہی امی کے مقدس سایہ کے بغیر زندگی کے بقیہ شب و روز گذارنے کے تصور سے وہ بے چینی تھی جو اس تحریر کے وقت بھی اس طرح اثر انداز ہے کہ بہ قول بشیر بدر میرا یہ مضمون ع

کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

اس دنیا کی ساٹھ سے زیادہ بہاریں دیکھ لینے، اور خود دادا نانا بن جانے والا آدمی اگر اپنی ۹۰ برس سے زیادہ عمر پا کر موت سے ہم آغوش ہو جانے والی ماں کی جدائی پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کرے تو دنیا یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوگی کہ آخر یہ سٹھیایا ہوا انسان چاہتا کیا ہے؟ اتنی طویل عمر پا کر، اور اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کی ذات کی تمام بہاریں دیکھ کر کوئی عورت اس دنیا سے رخصت ہو گئی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا؟ کیا علم اور دین سے برائے نام ہی سہی، رشتہ

رکھنے والا یہ آدمی اتنی سادہ سی حقیقت سے بھی نا آشنا ہے کہ ؎

یہ رنگ و بہار عالم ہے، کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی، کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

لیکن وہ لوگ جو گھر میں کسی بڑے کے وجود کی لذت سے آشنا ہیں، اور وہ لوگ جو ماں کے آنچل میں منھ چھپا کر ہر فکر و غمِ دنیا کو بھول جانے کا تجربہ رکھتے ہیں، وہ وہی کہیں گے جو مجھ سے تعزیت کرتے ہوئے معروف دانشور برادرم ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب نے کہا کہ

''ماں ۸۰؍برس کی ہو یا ۱۸۰؍برس کی، اور اولاد چاہے ۱۰۰؍برس کی ہو جائے، مگر ماں کے رہتے وہ اپنے کو گھر کا چھوٹا ہی سمجھتی ہے'' ـــــ اور یہ اپنے کو چھوٹا قرار دے لینا، بہت سارے مفاسد کا علاج بھی ہے، اور ڈھیر ساری فکروں سے نجات دلا کر قوت عمل کو تیز گام کرنے کا ذریعہ بھی۔

والد ماجدؒ کی ۱۹۹۴ء میں وفات کے بعد بھی والدہ ماجدہ کے سایۂ شفقت کے باقی رہنے کی وجہ سے یقینی طور پر میں اپنے گھر کا چھوٹا ہی رہا ـــــ لیکن ۳۰؍نومبر ۲۰۱۴ء کو نماز عصر کے وقت سے گھر میں میری حیثیت تبدیل ہو گئی۔ میں ایک ہی مکان میں رہنے والے اپنے چاروں بھائیوں میں باعتبار عمر بڑا ہونے کی وجہ سے گھر کا بڑا بن گیا ـــــ ''مجبوری کی اس بڑائی'' کی حقیقت بہت پہلے والد ماجدؒ نے یوں واضح کر دی تھی کہ

''بڑائی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ جب تمہارے بڑے موجود نہ رہیں گے تو تم خود بخود بڑے بن جاؤ گے، مگر ''مجبوری کی اس بڑائی'' کو حقیقتاً بڑائی نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ ممکن ہے کہ تمہارے چھوٹوں میں تم سے زیادہ باصلاحیت اور لائق احترام لوگ موجود ہوں، لیکن سن و سال اور عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے بڑے تم ہی کہلاؤ گے۔ حقیقتاً بڑائی تو یہ ہے کہ اپنے بڑوں

کے رہتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور کمالات کی وجہ سے تم ایسے
بڑے بن جاؤ کہ تمہارے بڑے بھی خوشی اور فخر کے ساتھ تمہیں
بڑا کہہ کر پیش کریں۔"

میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ میں کسی بھی طرح اس "بڑائی" کا حامل نہیں ہو سکا جس کو میرے والد ماجدؒ نے "حقیقی بڑائی" سے تعبیر کیا تھا ــــ اس کے باوجود "مجبوری کی بڑائی" کا بوجھ ڈھوتے ہوئے ہی مجھے اس دنیا سے جانا ہے؟۔

چوں کہ آج کی دنیائے شعروادب میں "ماں" کو موضوع سخن قرار دے کر "الفاظ کی بازیگری" ایک فیشن بن چکا ہے۔ اور جذبات محبت وعقیدت کے بجائے الفاظ کے حوالہ سے یوں تبصرہ کیا جانا عام ہو چکا ہے کہ فلاں شاعر یا فلاں ادیب نے "ماں" کے سلسلہ میں اپنی تحریر میں بڑی شگفتگی اور سلیقہ کا مظاہرہ کیا ہے؟ اور فلاں شخص تو "ماں" کے عنوان پر لکھنے میں ماہر ہے؟ ــــ ایسے میں اپنی ماں کی جدائی اور اس سے پیدا ہونے والے "خلا" کے سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنے کی رسم ادا کرنے کو میں اپنی ماں کی اس "ممتا" کی بے توقیری سمجھتا ہوں جس نے نہ جانے مجھے کتنے سنبھالے دیئے اور اپنے وجود سے میرے گھر کو اعتبار ووقار بخشا۔

میں اپنی "امی مرحومہ" کی عبادت و ریاضت، داد و دہش، غریب پروری، اور اقربا نوازی کا ذکر کرنا، نیز ان کے اور پروردگار کے بیچ کے اس راز کو فاش کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا جسے انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ "راز" بنایا تھا، اور میرا احساس ہے کہ اس کے برملا افشا و اظہار سے ان کی روح کو تکلیف ہوگی؟

امی کی اولاد میں میرے علاوہ میرے تین بھائی اور تین بہنیں ماشاء اللہ موجود ہیں ــــ سب کو اپنی ماں کی چاہت ملی، ان کے دامن کی ٹھنڈی ہوا ملی، اور ان کی مستجاب دعاؤں سے سب ہی کے گلشن حیات میں بہاریں آئیں ــــ مگر میں؟ اب اسے کیوں کر بیان کروں کہ مجھے بے ہوش وحواس، اور بے

ثبات عقل، امی کی اس فانی دنیا میں آخری سانس تک یہی احساس رہا کہ میں ان کا بڑا بیٹا ہی نہیں، ان کی مان اور بھرم بھی ہوں ــــ یقیناً اس میں امی کے کسی "انفرادی و امتیازی سلوک" کا دخل رہا ہوگا؟۔ لیکن اس کی تشریح کرنے سے میں خود بھی عاجز و قاصر ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ؎

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے رہتے ہیں اور پیمانہ خالی ہے

ابھی امی کا ساتھ چھوٹے ایک عشرہ ہی تو بیتا ہے، لیکن ان کی نسبت سے قائم ہونے والا میرا بھرم کھل چکا ہے، میرے گھر کی "مرکزیت" دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے، اور یقینی طور پر مجھے اپنی "امی" کی نسبت سے "دھرتی پر پیر نہ رکھنے والی روش" کو تبدیل کرنا ہوگا، تب ہی میں منھ لگانے کے قابل رہ سکوں گا ــــ کیوں کہ اب امی نہیں ہیں جن سے میرا اور میرے گھر کا "بھرم" قائم تھا؟

اس حقیقت سے کسے مجال انکار کہ اس فانی دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے ایک دن واپس بھی جانا ہے، لیکن مجھ "پیر نابالغ" کو اشاروں سے گھر آئے ہوئے مہمان کو سلام کرنے کی ہدایت دینے والا، میری عقل وفہم پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اب تک بڑوں سے گفتگو کرنے کا قرینہ سکھاتے رہنے والا، اور بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے پر اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے گھڑکنے اور جھڑکنے والا، کوئی اب اس سرائے فانی میں کہاں مل سکے گا؟ امی سے اب تو حشر ہی میں ملاقات ہو سکے گی ــــ خدا کرے کہ یہ ملاقات اس حال میں ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے، اور ہم دونوں سے ہمارا رب کریم خوش و راضی ہوں۔ اس وقت تک کے لئے بوجھل دل، اور اس "احساس بڑائی" کے ساتھ جو امی عطا کر کے رخصت ہوئی ہیں یہی کہنے پر قناعت کرنا ہے کہ

خدا حافظ امی

مولانا محمد سالم قاسمیؒ

(میرے آخری استاذ)

۱۴/اپریل ۲۰۱۸ء کو یہ المناک خبر آئی کہ متکلّم اسلام، استاذ الاساتذہ، خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب صدر مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند نے داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے عالم فانی سے عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خبر اگرچہ غیر متوقع نہ تھی اور کبرسنی کے ضعف و نقاہت کے باعث تشویشناک حالت اور روز افزوں ڈھیلی پڑتی حیات مستعار کی ڈور کی اطلاعات کئی دنوں سے مل رہی تھیں، لیکن حیات مستعار کی ڈور ٹوٹ جانے کی اطلاع نے ساری دنیا خصوصاً ایشیا میں پھیلے ہوئے حضرت والا کے ہزار ہا شاگردوں، مستفیدوں اور عقیدت مندوں کو اس لئے بہت زیادہ مغموم کر دیا کہ۔

وما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

رسمی ہی نہیں، حقیقی تعزیتوں کا سلسلہ جاری ہے اور حضرت والا کی نسبتوں و خصوصیات کے حوالوں سے اہل تعلق اپنے اپنے جذبات عقیدت و محبت کا اظہار کر رہے ہیں —— حق تعالیٰ ان جذبات عقیدت و محبت کو اپنے بندوں

(جن میں راقم ناکارہ ہی نہیں، علمائے اعلام اور عارفین و کاملین واتقیا بھی شامل ہیں) کے اظہار عقیدت کو سفارش والتجا قرار دے کر حضرت الاستاذ کے ساتھ اپنے شایان کرم معاملہ فرماتے ہوئے اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے (آمین) و ما ذالك علی الله بعزیز۔

ایک پامال سا لفظ ہر بڑی اور اہم شخصیت کے ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہونے پر ”خلا“ لکھا اور بولا جاتا ہے کہ فلاں......کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے؟—— لیکن اپنی ذاتی نسبت اور محدود معلومات کے حوالہ سے حضرت الاستاذ کی جدائی کو ”خلا“ سے تعبیر کرتے ہوئے راقم الحروف بہ حلف کہہ سکتا ہے کہ اس کے لیے یہ لفظ رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ کیوں کہ گھریلو و مکتبی تعلیم سے لے کر دارالعلوم دیوبند اور پھر عصری درس گاہوں تک اس کے گہربار اساتذہ کے ”سلسلۃ الذھب“ کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی اور ”نسبت اعتبار“ سے محروم ہو کر اب وہ اس دنیا کی بچی کھچی زندگی کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بسر کرنے پر مجبور ہو گیا—— یعنی

اک شخص کہہ رہا تھا سردار چیخ کر
شہر مراد لٹ گیا انسان مرگیا

یہ تو کوئی قابل التفات بات نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی (۷۰-۱۹۶۷ء) میں حضرت والا کی ذات ان کے اس ادنیٰ شاگرد کے لئے اس طرح ”آئیڈیل“ بنی رہی کہ ان جیسا علمی وقار، پابندی اوقات، انداز تدریس اور طرز خطاب ہی نہیں، ان جیسی وضع قطع اور لباس و رفتار پالینے اور حاصل کر لینے کی خواہشیں و تمنائیں مچلتی رہیں —— اور اس دوران چھپ چھپا کر بارہا ان کی نقل کرنے کی سعی لاحاصل بھی جاری رہی —— اسے ”ناقابل التفات“ اس لئے قرار دیا کہ میری طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر نہ جانے کتنے حضرت والا کے شاگرد و منتسبین ہوں گے جن کے دلوں میں یہ تمنائیں

انگڑائیاں لیتی رہی ہوگی؟ ——— لائق التفات وقابل فخر بات یہ ہے کہ اس راقم
وکمترین شاگرد کو بھی نہ صرف اپنے استاذ گرامی کی خصوصی توجہات بلکہ ایک
''اعتماد خاص'' اس دور کم سنی وطالب علمی سے لے کر اس دور پیری ورخصت تک
حاصل رہا۔ و ذالك فضل الله يؤ تيه من يشاء۔

میرے دور طالب علمی کا غیر منقسم دارالعلوم دیوبند آج سے بہت کچھ
مختلف تھا، اور یہ وہ دور تھا جب میرے ممدوح حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم
قاسمیؒ کے بھی بہ ہر اعتبار بڑے اور ان کے اساتذہ بھی دارالعلوم میں موجود تھے
اور وہ اپنے والد ماجد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور اپنے
اساتذہ حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب ودیگر
کے ہوتے یقیناً چھوٹے تھے، لیکن اس کے باوجود اپنی کچھ پرکشش
''خصوصیات'' کی وجہ سے وہ اپنے بڑوں کے درمیان بھی ایک امتیازی مقام
رکھتے تھے۔ مثلاً وہ مہتمم زادے اور طلبہ کے خیال کے مطابق ''مستقبل کے مہتمم
''ہونے کے باوجود اپنے زیر تدریس اسباق میں حاضری اور نصاب کی تکمیل،
اپنے حلم وتدبر، اپنی خوش خلقی وخوش لباسی، اور سب سے بڑھ کر اوقات کی قدر و
پابندی میں نمایاں مقام کے حامل تھے ——— اوقات کی پابندی کا تو یہ عالم تھا
کہ تعلیمی گھنٹہ شروع ہونے کے بعد اگر ۵/منٹ تک وہ درس گاہ نہ آتے تو ہم طلبہ
کو یقین ہوجاتا کہ آج مولانا نہیں آئیں گے اور ''سبق نہ ہونے کا جشن'' منانے
کے لئے طلبہ اپنی کتابیں اٹھائے ہوئے واپس چلے جاتے تھے؟ اس روایت کی
پابندی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایسے ہی ایک موقع پر چند منٹ
کے انتظار کے بعد ہم طلبہ ''آج چھٹی ہے'' کا نعرہ زیر لب لگاتے ہوئے درس گاہ
(دارالتفسیر) سے باہر نکل کر زینوں سے اتر ہی رہے تھے کہ دور سے حضرت والا کو
آتا دیکھ کر جلدی جلدی پھر درس گاہ میں واپس آگئے، لیکن کافی دیر تک انتظار کے
بعد بھی جب وہ درس گاہ میں نہیں آئے تو مایوس ہوکر ہم طلبہ پھر جو واپس لوٹے تو

دیکھا کہ حضرت والا ایک دفتر میں بیٹھے ہوئے اگلے تعلیمی گھنٹہ کا انتظار کر رہے
ہیں ——— انہوں نے اگلے تعلیمی گھنٹہ کا بیٹھ کر انتظار کرلینا گوارہ کیا، مگر اپنے
اعتبار وامتیاز کو مجروح کر کے تاخیر کے ساتھ سبق پڑھانے کے لئے درس گاہ آنا
گوارہ نہیں کیا ——— کیا اوقات کا یہ ضبط واہتمام ہم جیسے غافلوں ولاپرواہ
لوگوں کے لئے تازیانہ عبرت نہیں ہے؟

یوں تو حضرت مولانا کا شمار دارالعلوم کے مقبول اساتذہ میں ہوتا تھا اور
تمام علوم میں دسترس ہونے کی وجہ سے وہ اپنے سے متعلق تمام اسباق کا حق اس
طرح ادا کرتے تھے کہ ہر استعداد وصلاحیت کا طالب علم مطمئن ہوجاتا تھا لیکن
علم الکلام ان کا خاص اور موروثی موضوع تھا جس میں ان کے جوہر کھلتے تھے۔
چنانچہ شرح عقائد نسفی پڑھاتے ہوئے کلامی مسائل پر ان کی نکتہ آفرینیاں قابل
رشک ہوتی تھیں اور فن خطابت میں خصوصی مہارت کی وجہ سے وہ علم الکلام کے
پیچیدہ مسائل کو بھی ایسے دل نشین اور سہل انداز میں پیش کردیتے تھے کہ کمزور
سے کمزور استعداد والا طالب علم بھی کچھ نہ کچھ لے کر ہی اٹھتا تھا۔

وہ ایک کامیاب و باوقار معلم، صاحب طرز انشاء پرداز ومصنف، اور
مقبول ومعتبر خطیب ہونے کے ساتھ ہی بہت ہی لائق ودوررس منتظم بھی تھے۔
ان کی انتظامی صلاحیتوں کے مظہر دو ادارے تھے، ان میں سے ایک دارالعلوم
کی طرف سے ان کی سربراہی میں قائم کیا گیا شعبہ ''معارف القرآن'' اور دوسرا
خود ان کا اپنا قائم کردہ ذاتی ادارہ ''جامعہ دینیات اردو دیوبند'' تھا۔ اول الذکر کا
خصوصی ہدف علوم قرآنیہ پر تحقیق تھا جس میں خود حضرت مولانا پوری دل جمعی
کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اس شعبہ کی طرف سے متعدد تحقیقی کتابیں
شائع ہوئیں، ان میں سے ایک ''جائزہ تراجم قرآنی'' نامی حضرت مولانا کی
تحقیقی وقیمتی کتاب بھی تھی جو حضرت والا نے اپنے ناکارہ شاگرد کو بہ طور خاص
مرحمت فرمائی تھی۔ جب کہ دوسرا بڑا ادارہ ''جامعہ اردو علی گڑھ'' کے طرز پر

"جامعہ دینیات اردو دیوبند" نامی مراسلاتی نصاب وامتحانات کا ادارہ تھا جسے حضرت مولانا ہی نے قائم کیا اور اس کا دفتر بھی ان کے رہائشی مکان "طیب منزل" کی بالائی منزل پر تھا۔ جامعہ اردو ہی کی طرح اس ادارہ کی طرف سے سالانہ چار امتحانات ابتدائی دینیات اردو، عالم دینیات اردو، ماہر دینیات اردو، اور فاضل دینیات اردو کے نام سے مقررہ سینٹروں پر منعقد ہوتے تھے اور کامیاب ہونے والے طلبہ کو خوبصورت اسناد دی جاتی تھیں۔

جامعہ دینیات اردو اور اس کا پورا نظم و انتظام، حضرت مولانا کی علمی فتوحات، دور بینی و دوراندیشی، ترسیل علم کی سہل الحصول راہوں کی تلاش، فکر رسا، اور مہم جوئی کی ایسی مثال ہے جس کا دور دور تک تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چوں کہ حضرت والا کی عطا فرمودہ جرأتوں کے طفیل میں اپنی کم سنی کے باوجود ان سے ملاقات کرنے —— بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ان کا دیدار کرنے اور ان کی مشغولیات کا مشاہدہ کرنے کے لئے اکثر، بلکہ بسا اوقات ہفتہ میں کئی بار بعد نماز مغرب "جامعہ دینیات اردو" کے دفتر جاتا تھا، اس لئے کسی قدر قریبی مشاہد کی حیثیت سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اتنے بڑے اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے نظام کا محور حضرت مولانا ہی کی ذات تھی جس میں ان کے قریبی مشیر ومعاون کی حیثیت سے مولانا عبدالرؤف عالی، مولانا محمد حسن باندوی، اور مولانا عبداللہ جاوید شامل تھے .... اور بس! (یہ میرے دور کم سنی کے غیر تجربہ کارانہ مشاہدہ کی بات ہے —— ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی شامل ہوں جس کا مجھے علم نہ ہو)۔ جامعہ کے ان امتحانات اور ان کی اسناد کی کشش نے اردو اور دینی علوم دونوں کو ان حلقوں تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا جہاں تک کسی دوسرے واسطہ سے رسائی نہیں ہوسکتی تھی۔

غالباً اب دارالعلوم کا شعبہ "معارف القرآن" اور حضرت مولانا کا "جامعہ دینیات اردو" اپنی فعالیت کو کھو چکے ہیں —— اور یہ اسی لئے کہ کبرسنی و

دیگر عوارض کی وجہ سے یہ دونوں ادارے حضرت والا کی بیدار و مؤثر سرپرستی سے محروم ہوچکے تھے؟ والعلم الحقیقی عنداللہ۔

میرے دور طالب علمی کے دوسرے تعلیمی سال (۶۹-۱۹۶۸ء میں دارالعلوم میں طلبہ کی حشر انگیز اور اس وقت تک کی تاریخ کی سب سے جارحانہ و بدلحاظی کی حامل اسٹرائک ہوئی، اور ظاہر ہے کہ یہ اسٹرائک انتظامیہ ہی کے خلاف تھی جس کے اس وقت سربراہ اعلیٰ اور مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے جن کے فرزند اکبر حضرت مولانا محمد سالم صاحب ان کے مشیر خاص اور دارالعلوم کے باوقار استاذ تھے۔ اسٹرائک کے لیڈروں نے پوری طرح دارالعلوم کی عمارات پر قبضہ کرکے یہ "حکم" جاری کردیا تھا کہ مطبخ و صفائی کے عملہ کے سوا انتظامیہ واساتذہ کے عملہ میں سے نہ کسی کو دارالعلوم کے اندر آنے کی اجازت ہوگی نہ ہی کسی طالب علم کو اساتذہ کے گھر جاکر ملنے و ملاقات کرنے کی اجازت ہوگی۔ پولیس (اور جلاد) کی شکل کا طلبہ کا ایک دستہ بنادیا گیا تھا جو عام طلبہ کی ہر نقل وحرکت پر نظر رکھتا تھا، اور ادنیٰ سا شک ہوجانے پر زدوکوب اور قید وبند کی صعوبتوں سے دوچار کرتا۔ عام طالب علم نہ دارالعلوم کی چہاردیواری کے باہر نکل کر کسی سے دادفریاد کرسکتا تھا نہ ہی "اسٹرائیکی لیڈروں" کے کسی حکم سے سرتابی کرسکتا تھا۔ صبح سے دیر رات تک وقفہ وقفہ سے جلسے ہوتے رہتے جس میں اشتعال انگیز تقریروں ونظموں کے ذریعہ اپنے مطالبات پیش کرتے ہوئے طلبہ کی ذہن سازی کی جاتی، اس دوران "پولیس دستہ والے" طلبہ کے کمروں میں گھوم گھوم کر جاتے اور جلسہ میں شریک ہونے کا حکم جاری کرتے رہتے —— اسی سلسلہ کا ایک "انتظام" یہ بھی تھا کہ اسٹیج پر آکر تقریر کرنے اور اسٹرائک کی حمایت وتائید میں نظماً ونثراً بیان دینے کے لئے ہر ضلع کے طلبہ کی نمائندگی لازمی قرار دی گئی۔ اگر کسی ضلع کی نمائندگی نہ ہوتی یا کم ہوتی تو "پولیس دستہ" کے لوگ اپنے انداز میں نمائندگی درج کراتے؟۔

خلاصہ یہ کہ ایک عجیب خوف و ہراس کا عالم تھا، اور اس ''جارحانہ اسٹرائک'' میں دل سے آمادہ نہ ہونے والے طلبہ بھی اختلاف کی جرأت نہیں کرسکتے تھے.........ورنہ انہیں ''عتاب'' سے کون بچاتا؟۔

اس وقت لکھنؤ ضلع سے صرف میں اور اسی تعلیمی سال میں مظاہر علوم سہارن پور سے آکر دارالعلوم میں داخلہ لینے والے میرے عم زاد مولانا عبدالعلیم فاروقی ——— یعنی ہم دو بھائی ہی تھے، جو حضرت مہتمم صاحب و دیگر اساتذہ دارالعلوم سے اپنے دیرینہ خاندانی رشتوں کی وجہ سے کسی طرح اس اسٹرائک کا حصہ نہیں بننا چاہتے تھے۔ تاہم کب تک؟ ——— آخر ایک دن یہ پتہ چلا کہ آج رات میں کسی وقت ہمارے کمرہ پر ''چھاپہ'' پڑے گا؟ چوں کہ ہمارا اس وقت کے ''دارالشفاء'' کا کمرہ احاطہ دارالعلوم سے کچھ ہٹ کر تھا، اور پھر ہمارے اغل بغل شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کی قیام گاہ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی اہلیہ صاحبہ کا مکان بھی تھا۔ اس لئے ہم لوگ نسبتاً ''کھلے'' میں تھے ——— اور اسی کا فائدہ اٹھا کر ہم دونوں بھائی ہمت کر کے چھپتے چھپاتے قریب ہی میں واقع حضرت مولانا محمد سالم صاحبؒ کی قیام گاہ میں بعد نماز مغرب پہنچ گئے۔ حضرت مولانا نے ہمیں اس طرح ہواس باختہ دیکھ کر بڑی شفقت کے ساتھ دریافت فرمایا کہ کیسے آگئے؟ اور کیوں آئے؟ ہم نے اپنی داستان سناتے ہوئے منھ بسورتے اور آنسو بہاتے کہا کہ حضرت اسٹرائکی لیڈروں کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ آج وہ دھاوا بولیں گے ——— اب ہم کیا کریں؟ اور ان کے عتاب سے کیسے بچیں؟ ہماری ''داستان درد'' سن کر حضرت نے جو فرمایا وہ ان کی عالی ظرفی، خردنوازی، نسبتوں کے لحاظ، اور ایثار واعتماد کی سنہری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے کہ حضرت نے خود اپنے، اپنے والد ماجد اور چہیتوں کے خلاف بولنے کی نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب دیتے ہوئے فرمایا ہمیں آپ کی سعادت مندی اور تعلق پر اعتماد ہے۔

آپ ہم لوگوں کی طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ آپ لوگ کس جبر کا شکار ہیں ——— اس لئے ان کے مطالبہ کو پورا کرکے ان کے عتاب سے اپنے کو بچا لیجئے اور ضروری ہو تو ''ہمارے خلاف'' ان کے اسٹیج سے تقریر بھی کر دیجئے گا ——— اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب و دیگر منتظمین سے ہم بات کرلیں گے۔

حضرت والا کے اس حیرت انگیز، لیکن اطمینان بخش جواب کو لے کر بہ عجلت تمام ہم لوگ اپنے کمرہ میں واپس آگئے ——— اور پھر وہی ہوا جس کی پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ نصف شب کے بعد اسٹرائکیوں کے سب سے محبوب قائد اور اس وقت کے سب سے جارح و بدکلام لیڈر اپنے حواریوں کے ساتھ ہمارے کمرہ میں آدھمکے، اور کسی ''رورعایت کے بغیر'' صبح کے جلسہ میں اسٹرائک کی حمایت میں پرزور تقریر کے لئے ہم دونوں بھائیوں میں سے مولانا عبدالعلیم صاحب کا نام منتخب کرکے لکھ لیا، اور پھر دوسرے دن ان کی تقریر کرا کر ہی دم لیا؟

اب اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کی کرم فرمائی اور ''اعتماد خاص'' کا ایک نمونہ اس طرح بھی سامنے آیا کہ جب جارح و اسٹرائکی طلبہ کی شورہ پشتیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں تو مجبوراً دارالعلوم کی انتظامیہ نے پولیس کی مدد طلب کی، اور دارالعلوم میں تا اطلاع ثانی تعطیل کا اعلان کرتے ہوئے دارالاقامہ (ہاسٹل) کو طلبہ سے خالی کرا کے انہیں اپنے اپنے گھروں کو روانہ کر دیا ——— پھر جب کم وبیش ایک ماہ کی طویل مدت کے بعد انتظامیہ کی طرف سے دی گئی اطلاع پر ہم دونوں بھائی بھی دوبارہ دارالعلوم پہنچے تو حالات پوری طرح قابو میں آچکے تھے۔ ۳۵؍ اسٹرائک کے سرغنہ قرار پانے والے طلبہ کا اخراج ہو چکا تھا اور ایک فہرست ''مشتبہین'' کی بھی جاری ہو چکی تھی۔ ہم لوگ مطمئن تھے کہ ہمارا نام ان دونوں میں سے کسی فہرست میں نہیں تھا، اور ہم یک سوئی کے ساتھ اپنی تعلیم میں مشغول ہو گئے تھے کہ اچانک ایک ''افتاد'' اس طرح آئی کہ ہمیں اطلاع ملی کہ

ہمارے خصوصی کرم فرما اور خیر خواہ و دعا گو بزرگ حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ہم دونوں بھائیوں سے ''دارالعلوم کی اسٹرائک میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے'' سخت ناراض ہیں اور اپنے خدام کو تاکید کردی ہے کہ اگر ہم ملاقات کے لئے حاضری دیں تو منع کردیا جائے —— یہ اطلاع ہم دونوں ہی کے لئے سخت تشویش و اضطراب کا باعث بنی، خصوصاً اس وجہ سے کہ حضرت ناظم صاحب کو ہماری اسٹرائک میں سرگرم شمولیت کی جو اطلاع ملی تھی وہ یقیناً ''دوستوں کی حاشیہ آرائی'' تھی —— لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حضرت کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرکے ان کی ناراضگی دور کرنے کا سامان کیوں کر کیا جائے؟ بہت غور و فکر کے بعد ایک مرتبہ پھر حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم صاحب ہی کی خرد نوازی و کرم فرمائیوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے چارہ گری کی درخواست کی، حضرت والا نے ایک مرتبہ پھر اپنی نوازشوں کی بارش کرتے ہوئے ہمارے درد کا فوری مداوا کرنے کا فیصلہ فرمایا، اور ہم دونوں کو بیٹھنے اور انتظار کرنے کا حکم دے کر ''طیب منزل'' ہی کے ایک کمرہ میں چلے گئے۔ کم و بیش نصف گھنٹہ کے بعد حضرت والا اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ تھامے ہوئے اس حال میں واپس آئے کہ آپ پسینے پسینے ہوچکے تھے۔ پھر حضرت ناظم صاحب کے نام لکھے گئے اس سفارشی خط کو لفافہ میں رکھوا کر ہمارے حوالہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ یہ خط لے کر حضرت کے پاس جایئے، انشاء اللہ کام ہوجائے گا —— چنانچہ یہی ہوا کہ جب ہم لوگوں نے سہارن پور پہنچ کر حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں وہ سفارشی خط پیش کیا تو اس کا مطالعہ کرتے ہی ان کی ساری شکایات دور ہوگئیں، انہوں نے نہ صرف ہمیں معاف کرکے اپنے قدموں میں جگہ مرحمت فرمائی بلکہ اپنی شفقت آمیز نصیحتوں، اور رقت آمیز دعاؤں سے نوازنے کا سلسلہ جاری فرمادیا —— کاش کہ حضرت الاستاذ کا وہ سفارش نامہ

یا اس کی نقل ہمارے پاس محفوظ ہوتی! تاکہ ہم اس ''دستاویز اعتماد'' کے سہارے سرخروئیاں حاصل کرسکتے! —— حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک سفارشی خط ہی نہیں تھا بلکہ ایک عالم و دانا اور آداب شناس خرد کا اپنے صاحب نسبت و صاحب علم و عمل بزرگ کے نام لکھا ہوا ایک ایسا مؤثر و طاقتور رقعہ تھا جس نے فوری اثر سے اپنا کام تو کیا ہی۔ مزید یہ کہ حسن تحریر، حسن ادا، اور عرض مدعا کے باسلیقہ نکات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہم بے سلیقہ لوگوں کے واسطے اس کی حیثیت ''دستاویزی'' بھی تھی۔ یوں تو وہ ایک وقتی ''سفارش نامہ'' تھا، اور اپنا کام بن جانے کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی —— لیکن اس خط میں ہم پر اپنے اعتماد کا اظہار کرکے حضرت والا نے خاندانی نسبتوں اور ذاتی سعادت مندیوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہاں تک تحریر فرمایا تھا کہ ''میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دارالعلوم کے اس ہنگامے اور اکابر کے خلاف برپا کئے جانے والے اس تشدد سے ان بچوں کا نہ کسی قسم کا کوئی تعلق رہا نہ ہی یہ اس پر راضی رہے۔ اور جبراً و کرہاً انہیں اپنے تحفظ کے لئے جتنا شریک ہونا پڑا اس میں بھی ان بچوں سے زیادہ آپ کے اس ناکارہ خادم کا دخل تھا اور اسی کے ایما پر ان بچوں نے شورہ پشتوں کی تائید میں وہ تقریر کی جسے مبالغہ آمیز انداز میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس لئے آپ کی تکلیف کا باعث ان بچوں سے زیادہ آپ کا یہ خادم بنا ہے جو بصد ادب اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کا طلب گار ہے اور حضرت سے یہ درخواست کرتا ہے کہ ان سعید و صالح بچوں کو اپنی شفقتوں و دعاؤں سے محروم نہ کریں'' (کم و بیش مفہوم یہی تھا، ممکن ہے کہ الفاظ میں کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہو)۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تحریر خود صاحب تحریر کی کس عالی ظرفی، وسعت قلبی، اور نسبتوں کے لحاظ و آداب شناسی کی غماز ہے؟ —— اسی لئے تو باحسرت و افسوس کہنا پڑ رہا ہے کہ اے کاش کہ وہ تحریر محفوظ ہوتی!

دارالعلوم کا دور طالب علمی ختم ہونے کے بعد حضرت والا سے ملاقات تو

بس گاہے ماہے ہی ہو پاتی تھی، لیکن میں انتہائی مسرت وفخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت والا کی خصوصی توجہات واعتماد سے کبھی محروم نہ رہا۔ چنانچہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ حضرت کے اس ''اعتماد خاص'' نے ان کے اس ناکارہ شاگرد کو ''امتحانی مرحلہ'' سے بھی گذار کر سرخ رو ہونے کی سعادت بخشی ——— ہوا یوں کہ جب حضرت مولانا ''آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت'' کے صدر منتخب ہوئے تو ایک دن حضرت کا فون آیا۔ چوں کہ میں اس وقت گھر میں نہیں تھا اور فون لینڈ لائن والا تھا اس لئے حضرت والا نے بہ تاکید اپنا نام بتا کر حکم دیا کہ وہ گھر آنے کے بعد فوراً ہم سے فون پر رابطہ کرلیں؟ چنانچہ گھر واپس آنے کے بعد اطلاع ملتے ہی میں نے فون پر رابطہ کیا تو حضرت والا نے اپنے مشاورت کا صدر منتخب کئے جانے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا کہ احباب کے اصرار پر میں نے یہ عہدہ اس شرط پر قبول کرلیا ہے کہ میں اپنے اعتماد وبھروسے کے ارکان بھی خود ہی منتخب کروں گا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میں نے آپ کو ''مجلس مشاورت'' کا رکن بنانے کا فیصلہ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے اپنے سوچے سمجھے لائحہ عمل کے خلاف اور آپ پر جبر ہے ——— لیکن میری ضرورت کا خیال کرتے ہوئے آپ اسے منظور کرلیجئے۔ آپ کی منظوری کے بعد اس کی باضابطہ ورسمی اطلاع آپ کو دے دی جائے گی۔

حضرت والا کا یہ حکم پاکر میں کچھ دیر اس لئے خاموش رہا کہ میں نے کچھ تو اپنی نااہلی پر نظر رکھ کر اور کچھ اپنے مزاج وطبیعت کے پیش نظر دیگر ملحوظات کی رعایت سے کسی بھی جماعت یا تنظیم میں اس کا ایک جز یا رکن بن کر شامل نہ ہونے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور ایسے متعدد مواقع آنے اور اصرار ہونے پر بھی میں نے اپنے اس فیصلے پر قائم رہتے ہوئے رکنیت اور قابل لحاظ عہدوں کو بھی نظر انداز کیا تھا ——— لیکن حضرت والا کے دوبارہ استفسار پر میں نے بس اتنا

ہی کہا کہ ''جیسا حکم ہو'' حضرت والا نے بھی جزاك الله کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کردیا ——— پھر کیا ہوا؟ اور کیا وجوہات پیش آئیں کہ نہ میرے پاس پھر کوئی ''باضابطہ ورسمی خط'' آیا، نہ کبھی حضرت والا نے تقاضا کیا، نہ ہی اس کا ذکر چھیڑنا میں نے مناسب سمجھا؟

اس واقعہ کو ذکر کرنے سے یہ بیان مقصود ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ملک کے اندر ہی بلا مبالغہ ہزارہا ہزار کی تعداد میں حضرت والا کے مستفیدین ومنتسبین موجود رہے ہوں گے ——— مگر میری خوش بختی کہ حضرت کے دل تک میری اتنی رسائی تھی کہ انہوں نے میرا انتخاب کرتے ہوئے مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا۔

آخر میں اپنی خودستائی نہیں، بلکہ حضرت الاستاذ کی خردنوازی، وسیع القلبی، اور اپنے ایک ناقابل ذکر شاگرد پر اعتماد اور اس کی حوصلہ افزائی کی مثال کے طور پر حضرت کے اس تعزیتی مکتوب کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میرے والد ماجدؒ کی وفات پر حضرت والا نے بہ طور خاص بھیجا تھا۔

> ''عمومی طور پر ملت نواز خدام دین، اہم شخصیات کے اٹھ جانے پر ارباب تعلق ومحبت کی نگاہیں، ان کے خانوادوں میں ان کا بدل نہ پاکر بدل ہوا کرتی ہیں۔ مگر الحمدللہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت عنداللہ کی منجملہ علامات میں خود آں عزیز کی مؤثر شخصیت ہے جسے حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آباء واجداد گرامی کی علمی واخلاقی روایات کا مکمل نمونہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مرحوم کو عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ عمر واقبال کی برکات کے ساتھ اس فیضان عائلہ گرامی کو آپ کے ذریعہ عموم وشمول عطا فرمائے۔ (آمین)[1]''

حضرت الاستاذ کے امتیازی اوصاف حمیدہ کا ذکر مکمل نہ ہوگا، اگر دارالعلوم

کے اجلاس صد سالہ کے بعد پیدا ہونے والے کرب ناک حالات اور پھر دارالعلوم کے دولخت ہونے کے حوالہ سے حضرت والا کی علوہمت، استقلال، اور پامردی کے ساتھ مخالف حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ''وقف دارالعلوم'' کی شکل میں شر سے ایک خیر برآمد کر لینے کا سرسری طور پر ہی سہی، ذکر نہ کیا جائے؟ اس حوالہ سے انتہائی اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس پورے ''شاخسانہ'' کا محور و مرکز حضرت والا ہی کی ذات تھی، اس لئے ان پر جو کچھ گذرنا تھا وہ گذر کر رہا، لیکن کمال ظرف وہمت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان پرآشوب اور حوصلہ شکن حالات میں اپنے اہل تعلق سے نہ کسی حمایت کا مطالبہ کیا، نہ ہی ان پر کسی قسم کا غیرضروری دباؤ بنا کر انہیں کسی ''آزمائش'' سے دوچار کیا؟

اس پوری ''ہنگامی مدت'' میں خود راقم الحروف کا یہ فیصلہ بہ تائید حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ رہا کہ اس نے اپنی زبان اور اپنے قلم کو کسی کی حمایت اور کسی دوسرے کی مخالفت سے محفوظ رکھتے ہوئے ''اپنی اوقات'' پہچان کر اپنے اکابر کے خلاف زبان طعن دراز کرنے کے بجائے خاموش رہ کر دعائے خیر کرتے رہنے ہی میں عافیت سمجھی — اگرچہ راقم الحروف کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ''البدر'' بھی دوڈھائی برس پہلے ہی سے جاری ہو چکا تھا، اور اس کے ''حلقہ، نیز اپنے اکابر واصاغر اور ہم سروں'' کی طرف سے بار بار شدید تقاضے بھی ہوئے کہ ع

کچھ تو لب کھول کہ ہنگامہ اٹھے دیر ہوئی

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ''بعض بڑوں'' وہم سروں نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''منافق اور نمک حرام'' کہنے سے بھی گریز نہیں کیا — مگر راقم الحروف نے اپنی زبان خاموشی سے انہیں بھی بس یہی جواب دیا کہ ؎

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان، جگر کس کا ہے

بہ ہر حال ''طوفان بلا سر سے گذر جانے کے بعد'' میرے لئے باعث صد فرحت وافتخار یہ بات ثابت ہوئی کہ میں اپنی اس ''غیر منفعت بخش'' روش کے طفیل اپنے تمام اکابر سے آنکھیں چار کرنے کے لائق رہا —— اور ظاہر ہے کہ ان میں سب سے اہم ومقدم ہمارے استاذ گرامی قدر ہی تھے، جن کی جدائی پر آج میں تو قلم کے آنسو بہا رہا ہوں لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اپنی بولتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے ہم غافلوں کو یہ پیغام دے رہے ہوں کہ ؎

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

بات ذرا لمبی ہوگئی —— اور شاید موضوع سے کچھ ہٹ کر بھی، کیوں کہ بولنے اور لکھنے والے تو حضرت الاستاذ کے علمی کمالات، تدریسی خدمات، ساحرانہ خطابات، یا پھر تصنیف وتالیف اور ارشاد ومعرفت کے حوالوں سے ان کے اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے پر اپنے رنج والم کا اظہار کر رہے ہیں —— اور غالباً اسی کا موقع بھی ہے؟ لیکن بہت سے بولنے اور لکھنے والوں کو ابھی بہت سے مواقع میسر ہیں، اور وہ آئندہ بھی بولتے اور لکھتے رہیں گے، جب کہ اپنے آخری استاذ کی اس دنیا سے رخصتی اور استاذ کے دیدار سے محرومی کے بعد مجھ جیسے تنہا تنہا شخص کے پاس اس کے سوا کہنے اور لکھنے کے لئے کچھ نہیں کہ ؎

پاس کوئی نہیں اور ہے بھی تو تنہائی ہے
آجا آجا کہ اکیلا ترا سودائی ہے
ہو کا عالم، سر بالیں، شب تنہائی ہے
ہائے کس وقت ''تمہیں'' لینے کو موت آئی ہے

سلام قولاً من ربکم طبتم فادخلوها خالدین —— یآ ایتها النفس المطمئنة ارجعی إلی ربك راضية مرضية فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

مولانا محمد واضح حسنیؒ —— اک مرد خدا مست تھا نہ رہا

۱۶؍جنوری ۲۰۱۹ء کو نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مشغول تھا کہ اسی دوران پہلے کچھ وہاٹس ایپ میسج آئے اور پھر فون کی گھنٹی بجی، اور دوسری طرف سے فون کرنے والے نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے عین اذان فجر کے وقت حضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی صاحب کی وفات ہوگئی۔ اول وہلہ میں اس اچانک خبر پر بے یقینی سی رہی۔ اسی لئے تلاوت مکمل کرکے آئے ہوئے میسج دیکھے تو اس خبر پر یقین کرنا ہی پڑا۔

خبر کی تصدیق کے لئے یہ مختصر چھان بین اس لئے کرنا پڑی کہ چندروز پہلے ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ بالکل چاق وچوبند اور میرے اپنے خیال کے مطابق پوری طرح صحتمند تھے جب کہ ان کے برادر اکبر حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ گو بہت قریبی نہ سہی، مگر مولانا واضح صاحب مرحوم سے اتنا رشتہ وتعلق تو تھا ہی کہ اگر وہ کسی سنگین بیماری میں مبتلا ہوتے تو مجھے کسی نہ کسی ذریعہ سے اطلاع مل ہی جاتی —— اس لئے ان کی اچانک خبر وفات نے غفلت کے پردے

سرکائے تو کچھ دیر کے لئے ہی سہی، اپنی موت بھی قریب نظر آنے لگی، اور اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ گذشتہ تین ہفتوں سے بستر علالت پر تھا۔ بہ ہر حال دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر بستر علالت ہی سے اٹھ کر ندوۃ العلماء اس لئے پہنچ گیا کہ آخری دیدار کرسکوں، کیوں کہ یہ یقین تھا کہ تدفین آبائی قبرستان رائے بریلی میں ہی ہوگی اور اس وقت میں وہاں جانے کی حالت میں نہ تھا۔ مولانا مرحوم کا اجلا اجلا اور منور چہرہ دیکھا جس پر موت کے کچھ آثار نہ تھے، بلکہ اس کا آئینہ تھا کہ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

ساتھ والے اسی کمرہ میں جہاں دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے، بڑے بھائی حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی بس ایک جھلک پانے کی غرض سے حاضری دی، حضرت مولانا کی خردنوازی کہ اس عالم میں بھی مجھے پہچان کر چادر کے اندر سے ہاتھ نکال کر مصافحہ کے لئے بڑھایا اور میں مصافحہ کرکے فوراً ہی اس کمرہ سے نکل آیا —— کیوں کہ وہ اس سے زیادہ نوازش کے حال میں نہ تھے اور میرے اندر ان سے کچھ کہنے یا زیادہ دیر تک انہیں اس حال میں دیکھنے کی تاب نہ تھی؟۔

حضرت مولانا واضح رشید صاحب وہاں چلے گئے جہاں جانے ہی کے لئے اس دنیائے فانی میں سب آتے ہیں —— کوئی نئی بات نہیں، پھر وفات کے وقت ان کی عمر بھی کچھ ایسی کم نہ تھی کہ دنیا والے یہ کہہ سکیں کہ بڑی کم عمری میں دنیا چھوڑ دی۔ تاہم قریبی لوگوں اور مستفیدین کی بات نہیں، کم وبیش دو ماہ کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی مجھ جیسے غافل وناقدرے شخص کو بھی جب خیال آجاتا ہے کہ اب جانے والے سے اس دنیا میں کبھی ملاقات نہ ہوسکے گی تو ایک

نا قابل بیان قسم کا احساسِ محرومی تو ہو ہی جاتا ہے ـــــ جب یہ کیفیت مجھ نا کارہ کی ہے تو ان کے قدر شناسوں وقدر دانوں اور ان سے سچی محبت کرنے والوں، اور ان سب کے سرخیل، ہر دم کے رفیق وانیس حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ اور مرحوم کے اکلوتے فرزند صالح مولانا جعفر مسعود صاحب ودیگر افراد خانہ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟۔

میرا شمار ان لوگوں میں نہیں جو مولانا واضح صاحب کے علمی وعملی رسوخ کے بارے میں کچھ گہری واقفیت رکھتے ہوں لیکن ان کی اردو وعربی کی جتنی تحریروں کے مطالعہ کا موقع ملا ان سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوا کہ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے اس سے خود پہلے گہری واقفیت حاصل کر لیتے اور بھرپور مطالعہ و مشاہدہ کے بعد ہی وہ اسے سپرد قلم کرتے۔ ان کی تحریریں استدلالی وتجزیاتی ہوتیں لیکن اسلوب نگارش انتہائی سہل وسادہ ہوتا۔ وہ کم لکھتے لیکن جو کچھ لکھتے اس میں گہرائی وگیرائی کے ساتھ ہی ان کے سوز دروں کی جھلک بھی صاف طور پر نظر آتی۔

عالمی منظرنامہ پر خصوصاً مشرق وسطیٰ کے حالات پر ان کی نہ صرف گہری نظر تھی بلکہ مسلمانوں کے تعلق سے ان کے پاس صرف وسوسے اور اندیشے ہی نہ تھے بلکہ خوشگوار تبدیلیوں کے لئے کچھ لائحہ عمل بھی تھے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ''فکری وقلبی واردات'' کو دوسروں تک اپنے قلم کے سہارے پہنچا کر اپنا بوجھ بھی ہلکا کرتے تھے اور ''ملّی امانت'' کو ملت تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

قلم کی زبان کے ساتھ ہی اپنے منھ کی زبان سے بھی عربی اردو دونوں میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا انہیں بھرپور سلیقہ تھا۔ اگرچہ ان کی کم سخنی ان کی ''شیریں سخنی'' کے لئے اس طرح حجاب بنی رہتی کہ ان کے کچھ بہت قریبی

شاگردوں ومتعلقین کے سوا بہت ہی کم لوگوں کو اس سے واقفیت رہی کہ وہ ایک قادرالکلام اور ''سہل ممتنع'' میں گفتگو کرنے والے خطیب بھی تھے۔ ان کے لہجہ میں گھن گرج تو نہ تھی لیکن ان کی شگفتہ خطابت میں ''ترسیل'' کی بھرپور صلاحیت ہوا کرتی۔ مجھے ذاتی طور پر تو ان کے خطابات سے مستفید ہونے کے بہت کم مواقع مل سکے لیکن ان کے کئی شاگردوں، خصوصاً اپنے سب سے چھوٹے فرزند معاویہ عبدالرحیم فاروقی ندوی سلّمہٗ کی زبانی ان کے زور خطابت وبیان کے متعدد واقعات سن کر ان کی ''زبان گویا'' سے بھی اسی طرح واقفیت ہوئی جس طرح ان کی ''زبان خاموش'' کا بارہا مشاہدہ ہوا تھا؟۔

نمود ونمائش سے پرہیز ہی نہیں، بلکہ اپنی شخصیت کو گُم کردینے، اور موقع بہ موقع اپنے برادر اکبر حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے روبرو اپنے کو ''ناقابل التفات'' گرداننے کی ان کی روش نے انہیں اس طرح ''مستورالحال'' بنا دیا تھا کہ معدودے چند لوگوں کے سوا شاید ہی کوئی صاحب نظر اس حقیقت کا ادراک کر سکا ہو کہ کم از کم عربی، انگریزی اور اردو، تین زبانوں پر مکمل عبور ہونے کی وجہ سے، اور پھر اسی کے ساتھ شخصیت کی سادگی وپرکاری کی وجہ سے ان کی وفات کے وقت ان جیسی ''جامع شخصیت'' دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے عالمی دینی وادبی مرکز میں بھی نہ تھی اور ان کی وفات سے جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا کچھ آسان نہیں ہے۔ و ما ذالك على الله بعزيز

اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ان تأثرات کا اپنے انداز میں اظہار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم، عربی زبان وادب کے رمز آشنا، البعث الاسلامی جیسے دنیائے عرب وعربی کے مقبول ومعیاری رسالہ کے مدیر اعلیٰ، نیز مولانا محمد واضح صاحب مرحوم کے قریب ترین رفیق وحمیم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی صاحب نے بھی کیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میری

شہادت مولانا موصوف کے تأثرات ہی سے مستفاد ہے؟۔

مولانا مرحوم کے دو امتیازی وصف (جن کا میں نے اپنی دوسری تحریر میں بھی ذکر کیا ہے) ایسے تھے جو انہیں اپنے معاصر و ہم رتبہ لوگوں میں بھی امتیاز عطا کرتے ہیں۔

اول ان کا عربی و اردو زبانوں کے ساتھ ہی انگریزی زبان پر بھی پورا عبور اور اس زبان میں لکھنے پڑھنے کی نہ صرف قدرت بلکہ اس کا سند یافتہ ''عالم'' ہونا جس کی وجہ سے وہ مغربی افکار و نظریات اور اس زبان میں اسلام و مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی زہر افشانیوں سے براہ راست (کسی ترجمہ اور اس کے ذریعہ مترجم کے اپنے افکار و نظریات کی دانستہ یا نادانستہ شمولیت کے بغیر) مطلع ہو کر ان اسلام و مسلم دشمنوں کے زہر کا اپنی بساط کے مطابق تریاق فراہم کیا کرتے تھے — اور ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ہماری صف علماء میں خصوصاً ان کے معاصر علماء کی صف میں ایسے افراد شاید خال خال ہی ہوں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ہو جانا بھی ضروری ہے کہ سطور بالا میں صرف انگریزی زبان سے واقفیت کے تعلق سے نہیں، بلکہ ''زبان پر عبور'' کے تعلق سے مولانا مرحوم کے امتیاز کا ذکر کیا گیا ہے — ورنہ صف علماء میں بھی انگریزی زبان میں لکھ پڑھ لینے والوں کی موجودگی سے انکار نہیں ہے۔

مرحوم کا دوسرا امتیازی وصف ''اخفائے حال و صلاحیت'' کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت پر تواضع وانکسار کے ایسے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ ان کے فضل و کمال کو تادم آخر ان کے ساتھ پاس رہنے والے کچھ بہت ہی قریبی و باصلاحیت و ذی شعور لوگوں کے سوا راقم الحروف اور اس جیسے بے شمار واقفین سمجھ ہی نہ سکے؟۔ اور پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس

وصف میں وہ علامہ اقبال کے اس شعر کی مکمل تفسیر تھے کہ ؎

کہہ رہا تھا شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

یقیناً وہ باتوفیق تھے کہ بولنے کی بھرپور صلاحیت رکھنے اور اس کا عملی تجربہ حاصل کر لینے کے باوجود بھی انہوں نے اپنی طلاقت لسانی کے ذریعہ ''اپنا لوہا منوانے'' کے بجائے اپنی خاموشی و اخفائے حال کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ شور و غوغا مچا کر اپنے وجود کو ثابت کرنے کے بجائے خاموش رہنا نہ صرف صاحب ظرف، بلکہ باکمال ہونے کی علامت ہے۔

میں مولانا مرحوم کی عملی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں، پہلا وہ جو انہوں نے اپنی آل انڈیا ریڈیو سے بہ حیثیت مترجم، پروڈیوسر، اور اینکر وابستہ رہ کر ''بولتی ہوئی شخصیت'' کے روپ میں گذارا، اور اپنی اس ملازمت کے دوران اپنے ''فرائض منصبی'' سے آگے بڑھ کر اپنی جودت طبع کے ذریعہ متعدد تمثیلی و تاریخی مواد پر مشتمل پروگرام پیش کر کے عالم عرب میں اپنے ملک کا بہترین تعارف کرایا۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ اس ''دوسری دنیا'' میں کسی مرعوبیت کے بغیر اپنے قول و عمل کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ ایک مولوی اور وہ بھی ''صاحب نسبت خالص مولوی'' چھا کر رہتا ہے بجھ کر نہیں، نیز یہ کہ ارباب ہنر جہاں رہیں ''اپنی چھاپ'' چھوڑ جاتے ہیں —— جب کہ ان کی زندگی کا دوسرا حصہ میں اسے قرار دیتا ہوں جو سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سے زندگی کی آخری سانس تک انہوں نے اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہ حیثیت استاذ، معتمد تعلیم، اور ادارہ کے ترجمان مؤقر عربی جریدہ ''الرائد'' کے رئیس التحریر (چیف ایڈیٹر) وابستہ رہ کر انتہائی خاموشی اور زبان رکھتے ہوئے بھی ''بے زبانی'' کے ساتھ گذارا —— اس دوران نہ جانے ان کے کتنے ہی

شاگرد، استاذ، اور کتنے ہی چھوٹے، بڑے بنتے گئے۔ اور جن ''ہاتھوں'' نے تراش کر انہیں کسی قابل بنایا تھا اس کا ذکر و چرچا کرنا نہ ان ''شاگردان رشید'' نے ضروری سمجھا نہ ہی اس ''شخصیت ساز درویش'' نے اسے قابل التفات گردانا ـــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ انہوں نے جس خاموشی کے ساتھ زندگی گذاری تھی اسی خاموشی کے ساتھ موت کو بھی گلے لگالیا۔ مگر اپنی ''زبان خاموش'' سے یہ کہتے ہوئے ہم سے رخصت ہوئے کہ ؎

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

سلسلۂ زریں کی ایک تابدار کڑی ہونے کی حیثیت سے مولانا مرحوم سے میری واقفیت تو تھی اور گاہے بہ گاہے ان کی خردنوازیوں اور الطاف کریمانہ کی وجہ سے ان سے ایک قلبی مناسبت بھی رہی لیکن اظہار ندامت کے لئے اپنی اس بے توفیقی کا ذکر کردینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سے جب بھی ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ان کے برادر بزرگ مخدوم مکرم حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے طفیل میں ہی حاصل ہوئی، کیوں کہ یہ ناکارہ صرف ان ہی سے ملاقات کے لئے غالباً کبھی گیا ہی نہیں اور انہوں نے بھی اپنی ''منصوبہ بند روش'' کے مطابق ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کیا ـــــ لیکن مجھ جیسے کوتاہ نظروں کے لئے ہوا کچھ یوں کہ ع

مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

مولانا کی وفات کے بعد عالم عرب کے مؤقر ترین علماء و اعیان کی طرف سے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے علمی مقام و خدمات کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا گیا، اور پھر ان کے صرف عربی کتابوں و مضامین ہی کی جو فہرست سامنے آئی اس نے نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ ایک قسم کے

احساس محرومی سے بھی دوچار کیا کہ اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے ان سے جو حاصل کرسکتا تھا وہ بھی نہ کرسکا؟ ـــــ ویسے یہ دنیا تو حسرتوں کی آماج گاہ ہے ہی، اور ہم ناقدروں کا نشان امتیاز ''قدر نعمت بعد زوال نعمت'' کل بھی تھا، آج بھی ہے۔

حق تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت کاملہ فرما کر ان کو اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے۔ (آمین)

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

مفتی سعید احمد صاحبؒ

۲۵؍رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کو یہ اندوہناک اطلاع آئی کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

پہلے دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے برسوں پہلے کے ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے جو اچانک یاد آ گیا ہے۔

ممبئی میں میری قیام گاہ پر ملاقات کے لئے میرے ایک کرم فرما اور دارالعلوم دیوبند کے ایک اچھے منصب سے علیحدہ ہونے والے خوش بیان وخوش گفتار فاضل دارالعلوم تشریف لائے۔ کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد بات ان کی دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کی آ گئی تو انہوں نے ''عمومی رویہ'' کے مطابق دارالعلوم دیوبند کی اس وقت کی انتظامیہ، خصوصاً مہتمم صاحب کی شکایات کے دفتر کھولتے ہوئے مہتمم دارالعلوم کو اس منصب کے لئے نااہل قرار دے کر ان کی شان میں ''سوءِ ادبی'' کا مظاہرہ شروع کیا تو میری ''نسبت قاسمی'' نے مجھے دفاع پر مجبور کیا، اور ''حدِ ادب میں رہتے ہوئے'' میں نے تلخ لہجہ میں گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے مہتمم صاحب مرحوم کی کچھ ''ظاہر و باطن خوبیوں'' کا بیان

کر کے ان کی شان میں کوئی گستاخانہ بات نہ کرنے کو کہا ——— رعایت اس بات کی بھی ضروری تھی کہ آں موصوف مجھ سے عمر میں بڑے تھے، بعض قابل لحاظ خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ ہی ''قاسمی نسبت'' کے علاوہ دارالعلوم میں ایک اچھے منصب پر فائز رہے تھے، اور پھر ان سے میرے دیرینہ خوشگوار تعلقات تھے۔ دوسری طرف دارالعلوم کی انتظامیہ خصوصاً مہتمم صاحبؒ کے سلسلہ میں کوئی ''برہنہ تبصرہ'' میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے میں نے بات چیت کا رخ دوسرے رخ پھیر دینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

وہ ''زخم خوردہ'' تھے۔ پھر فطری طور پر بہت حاضر جواب اور ''مناظرانہ صلاحیتوں'' کے حامل بھی تھے، اس لئے انہوں نے اپنے موقف کی تقویت میں بہت کچھ کہا اور اس سے بڑھ کر بہت کچھ کہنا چاہا، میری کئی باتوں کا انہوں نے ''ایسا توڑ'' بھی پیش کیا کہ مجھے خاموش ہونا پڑا؟ لیکن اس موضوع کی گفتگو کا اختتام بہرحال اس طرح ہی ہوا کہ نہ وہ مجھے مطمئن کر سکے، نہ ہی میں ان کو مطمئن کر سکا۔

اب جب کہ اس گفتگو پر کئی عشرے گذر چکے۔ اس وقت کے مہتمم صاحب اور ان پر ''ترچھی نگاہ'' ڈالنے والے وہ عالم دونوں ہی ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے۔ اور کہنا چاہئے کہ ''بات رفت گذشت'' ہو چکی تھی تو اچانک شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحبؒ کی وفات کی اطلاع پر اس گفتگو کی یاد اس لئے آ گئی کہ آں موصوف نے اپنے موقف کی تائید میں ایک ایسی ''قیمتی بات'' کہی تھی جسے نہ میں فراموش کر سکا، نہ ہی فراموش کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کو بس کسی بڑے مدرسہ یا زیادہ سے زیادہ سب سے بڑے مدرسہ کے مہتمم کی حیثیت سے آنک رہے ہیں ——— حالانکہ دارالعلوم کا مہتمم پوری دنیا میں پھیلے ہوئے علماء وفضلاء ومشائخ نیز جماعت دیوبند، فکر دیوبند اور

مسلک دیوبند کے حاملین کا غیر نزاعی مقتدیٰ و پیشوا ہوتا ہے، اور اس کی اس حیثیت کو تمام اکابر و مشائخ اور مدارس و مراکز نہ صرف بہ طیب خاطر تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اپنے ہر قول و عمل سے اس کا اظہار بھی کرتے رہنا ضروری قرار دیتے ہیں ـــــ یعنی دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر فائز ہونے سے پہلے رات کو سونے والا فقیر دارالعلوم کا مہتمم ہونے کے بعد صبح کو بادشاہ بن کر اٹھتا ہے۔'' (آخری پیراگرف کے علاوہ باقی تمام الفاظ تو ظاہر ہے کہ آں موصوف کے نہیں ہیں، لیکن مفہوم کو بیان کرنے میں مکمل احتیاط اور ذمہ داری سے کام لیا گیا ہے)۔

دارالعلوم کے ''مسند نشین اہتمام'' کی نسبت سے اس بھولے بسرے واقعہ کے ذکر کے بعد، اپنی طرف سے اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم کے منصب ''شیخ الحدیث'' کا معاملہ بھی جداگانہ ہے؟۔

یوں تو ہمارے مدارس کی اصطلاح میں ''شیخ الحدیث'' کسی بھی مدرسہ کے اس مؤقر استاذ کو کہا جاتا ہے جو ''بخاری شریف'' کا درس دیتا ہو (یہ اصطلاح بھی غالباً دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارن پور سے شروع ہوکر فروغ پائی ہے؟ واللہ اعلم) اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''بخاری شریف'' جیسی کتاب کی تدریس، بجائے خود نہ صرف بڑا اعزاز ہے، بلکہ اس منصب کی ذمہ داریاں سونپنے کے لئے ہر ادارہ کے ذمہ دار خوب سے خوب تر کا ہی انتخاب کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بخاری شریف کا درس دینے والا مدرس علم و فضل، اور تقویٰ و پاکبازی کے ساتھ ہی ''نفع رسانی'' میں یکساں نہیں ہوتا ـــــ اس کے باوجود ''شیخ الحدیث'' کو دیگر اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ وقعت و اعزاز حاصل ہوتا ہے، نیز تجربہ یہ بھی ہے کہ ''منصب

کی برکت'' یا درس بخاری سے وابستگی نے بیشتر اساتذہ کو اعزاز و اکرام کا ''واقعی حق دار'' بنا بھی دیا ہے۔ وَ ذالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

جہاں تک دارالعلوم کا معاملہ ہے تو اس کے مہتمم ہی کی طرح شیخ الحدیث کو بھی عالمی سطح پر جو تقدس، اعتبار، اور مرجعیت کا مقام حاصل ہوتا ہے وہ کسی بھی دوسرے ''شیخ الحدیث'' کو حاصل نہیں ہو پاتا ـــ اس کی متعدد وجوہات بھی ہیں اور اس کی ایک مستقل تاریخ بھی ہے، جس کا بیان اس وقت مقصود نہیں ہے۔

درج بالا تمہید محض اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہ چند روز پہلے ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب کے ذاتی اوصاف و کمالات اپنی جگہ، لیکن ان کی سب سے بڑی شناخت، اور ان کی وفات سے عالمی سطح پر تمام دینی و علمی حلقوں کے سوگوار ہونے کی بنیاد، ان کا دارالعلوم دیوبند کے منصب ''شیخ الحدیث'' پر فائز ہونا ہی ہے، جسے راقم الحروف ان کے لئے ''عطاء رب'' اور ان شاء اللہ ''ذخیرۂ آخرت'' قرار دیتا ہے۔

جہاں تک حضرت مفتی صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف و کمالات اور ان کی ''علمی فتوحات'' کا معاملہ ہے تو اسے خوب سے خوب تر انداز میں بیان کرنے کے لئے ان کے ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہزار ہا ہزار شاگرد و مستفیدین ہی سب سے زیادہ اہل اور اولین حق دار ہیں، جن میں ایک سے بڑھ کر ایک بافیض، باصلاحیت، اور ہنرمند لوگ شامل ہیں ـــــ راقم الحروف جیسا ''کم آشنا'' و کم سواد تو اس علمی خسارہ اور اپنی مادر علمی دارالعلوم کے خلاء پر بس یہی کہہ سکتا ہے کہ ؎

شہر خالی ہوا جاتا ہے بزرگوں سے مرے
کون اب پیار سے پوچھے گا، میاں کیسے ہو؟

حضرت مفتی صاحبؒ کے تعلق سے اتنی بات کا علم تو ہر طالب علم کو ہے کہ مرحوم ایک جلیل القدر عالم، مقبول ترین مدرس، بیدار مغز مصلح، شارح قرآن وحدیث، نمونۂ اسلاف، جرأت مند رہبر، اور معیاری دینی وعلمی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان صلاحیتوں کے حامل افراد کسی بھی دور اور کسی بھی معاشرہ میں معدودے چند ہی ہوا کرتے ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کی کمی پورے معاشرہ اور پورے دور پر اثر انداز ہوا کرتی ہے۔

راقم الحروف کی دشواری یہ ہے کہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند سے اپنا ''روحانی سلسلۂ نسب'' برقرار و بحال رکھنے کے لئے دارالعلوم کے اپنے مستند، معتمد اور باوقار شیخ الحدیث سے محروم ہو جانے کے غم میں شرکت کرتے ہوئے ''اظہار تعزیت'' ضروری ہے —— دوسری طرف حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ) سے ذاتی وعلمی روابط نہ ہونے کی وجہ سے صرف ''سنی سنائی اور لکھی لکھائی'' پر ہی اکتفا کرنا مجبوری ہے؟

راقم الحروف دارالعلوم دیوبند سے اپنی جیسی تیسی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۷۰ء میں واپس آگیا۔ جب کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی بہ حیثیت استاذ دارالعلوم میں آمد ان کے ایک ممتاز شاگرد جناب مولانا فضیل احمد ناصری کے بیان کے مطابق ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے عشرہ کے دوران تو راقم الحروف کا اپنی مادر علمی جانے آنے کا سلسلہ قائم رہا، اور کم از کم سال میں ایک مرتبہ اور کبھی اس سے زائد بھی دارالعلوم حاضری دینے کی سعادت ملتی رہی۔ اس مدت کے دوران مفتی صاحبؒ کا بہ حیثیت استاذ دارالعلوم میں تقرر ہو چکا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اپنے اساتذہ واکابر کی موجودگی میں وہ ''دب کر رہنے'' ہی پر مجبور تھے، اور وہ اس مقام ومرتبہ سے بہت دور تھے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بعد میں عطا کیا اور جس پر فائز ہو کر وہ ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے —— لیکن ان

کے شاگردوں کے درمیان ان کے اسلوب تدریس کی خوبیوں کے چرچے اسی وقت شروع ہوگئے تھے۔ ان کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب انہیں دارالعلوم کا شیخ الحدیث منتخب کیا گیا تو دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ سے لے کر دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے بیرونی حلقوں کی طرف سے نہ صرف اس انتخاب کی تحسین وتائید کی گئی بلکہ اسے ''حق بہ حق دار رسید'' قرار دیا گیا۔ اور حق تعالیٰ نے ان کو اس عظیم منصب کا حق ادا کرنے کی اس طرح توفیق عطا فرمائی کہ اس عظیم منصب کی نسبت سے دارالعلوم کا اختصاص وامتیاز پوری طرح باقی رہا۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز

تدریس کے علاوہ مفتی صاحبؒ کی اضافی خوبیوں میں تقریر وخطابت، اور ملک وبیرون ملک کے علمی واصلاحی افادات کے ساتھ ہی ان کے تصنیفی و تالیفی ذوق، اعلاء کلمۃ الحق، اور اتباع سنت کا اہتمام بھی ان شاء اللہ ان کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوں گے۔

خدمت حدیث سے وابستہ ہمارے اکابر حضرت شیخ الہندؒ، حضرت محدث سہارنپوریؒ (صاحب بذل المجہود) حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت شیخ الحدیثؒ سہارن پوری کی طرح حق تعالیٰ نے حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کو بھی تصنیف وتالیف کا اعلیٰ ذوق عطا فرمایا تھا اور ان کے قلم سے قرآن مجید کی تفسیر اور بخاری شریف وترمذی شریف جیسی حدیث کی کتابوں کی شروحات وجود میں آکر مقبول عام وخاص ہوئیں —— لیکن اس سلسلہ میں ان کی سب سے عظیم وناقابل فراموش امتیازی خدمت پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' ہے جو مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی مستند ترین، مقبول ترین، اور انقلاب آفریں کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی شرح ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی اس کتاب کو کما حقہ سمجھنا، اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا،

ہر دور میں کمال ورسوخ کی ایک دلیل گردانا گیا ہے۔ میرے دورِ طالب علمی میں اس کتاب کا درس اس وقت کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دیا کرتے تھے۔ دارالعلوم کی مسجد قدیم میں ہونے والے اس درس میں باذوق طلبہ ہی نہیں بلکہ متعدد اساتذہ کرام بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اور عام تاثر یہی تھا کہ اس کتاب کا حق علوم قاسمی کا ترجمان ہی ادا کرسکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے بہ توفیق الٰہی اس کتاب کی اردو زبان میں جو شرح لکھی اس نے برصغیر ہندوپاک میں خصوصی طور پر پذیرائی حاصل کی اور ''اپنے وبیگانے'' سب ہی اس عظیم خدمت کے حوالہ سے ان کے فضل وکمال کے اعتراف پر مجبور ہوئے۔

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحبؒ کی عملی زندگی کا ایک مثالی و قابل تقلید کارنامہ (جو ان کے اخلاص وللّٰہیت کا شاہد عدل ہے) یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں جب مالی طور پر فراغت عطا کی تو انہوں نے نہ صرف دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینا بند کردی بلکہ پچھلی تمام مدت ملازمت کی لی ہوئی تنخواہ کا حساب کرکے اسے دارالعلوم کو واپس کردیا۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند آمد سے قبل دارالعلوم اشرفیہ راندیر گجرات) میں دوران ملازمت لی ہوئی پوری تنخواہ کا حساب کرکے یہ رقم انہوں نے اس مدرسہ کو واپس کردی تھی ——— ہماری حرص وہوس کی دنیا میں مفتی صاحب کا یہ عمل لائق ستائش ہی نہیں، قابل تقلید ہے۔

یقیناً مفتی صاحب کی ذات سے ''کچھ نزاعات'' بھی جڑے ہوئے تھے۔ خصوصاً تبلیغی جماعت اور اس کے موجودہ امیر جناب مولانا محمد سعد کاندھلوی صاحب کے طریق کار اور ان کے کچھ بیانات پر ان کے اشکالات تھے، جنہیں انہوں نے وقتاً فوقتاً بہت ہی مدلل اور علمی انداز میں پیش کرکے اپنا ''فرض منصبی'' پورا کیا ——— یہ الگ بات ہے کہ ان کے اس اقدام کو ایک بڑے اور غیر علمی عوامی حلقہ میں ناپسندیدہ گردانتے ہوئے طنز وتعریض کا نشانہ بنایا گیا؟

اسی طرح مدارس، ارباب مدارس، خصوصاً اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں ان کے ''کچھ تلخ تبصروں'' اور اکابر کے ''معمول بہا'' سے منحرف رائے کی وجہ سے کئی مواقع پر علماء نے بھی ان پر نقد کیا ——— تاہم ان کی علمی جلالت، دارالعلوم سے وابستہ ان کی منصبی عظمت، اور ان کے اخلاص عمل کا ہر حلقہ کی طرف سے اعتراف واحترام برقرار رہا۔

راقم الحروف کی نظر میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کے ''منصب شیخ الحدیث'' پر فائز ہوکر نہ صرف اس منصب سے وابستہ امتیاز کو باقی رکھا اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر گامزن رہ کر یہ ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب اور سرخ رو رہے کہ دارالعلوم کا شیخ بخاری صرف حدیث کی ایک عظیم الشان کتاب کا مدرس نہیں ہوتا بلکہ حدیث کے حوالہ سے اس کو اس مبارک علم وفن میں اپنا رسوخ وامتیاز بھی اس طرح ثابت کرنا ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں اس کی بات کو قدر، وقعت اور اعتبار کے ساتھ سنا اور قبول کیا جاسکے۔

مفتی سعید احمد صاحب ہماری اس فانی دنیا سے کوچ کرکے اس عالم باقی کی طرف منتقل ہوگئے جہاں وہ ہم دنیا والوں کی ہر تعریف وتنقید سے بے نیاز ہوچکے۔ ہم اپنے رب کریم سے دعا گو ہی نہیں پر امید ہیں کہ وہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ فرماکر ان کی دینی خدمات کا اپنی شان رحمت کے مطابق صلہ عطا فرمائے گا۔ اسی کے ساتھ اس کے لئے بھی دعا گو ہیں کہ حق تعالیٰ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرماکر اس چشمۂ فیض سے آب یاری کے تسلسل کو باقی رکھے۔ (آمین)

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

ایک با اختیار مہتمم ایسے بھی؟؟

یادش بخیر! برسر قلم وہ نام ہے جس پر محمد علی جوہرؔ کا یہ مصرع اپنی نادانی و مردم ناشناسی کے اظہار کے لئے بہت موزوں ومناسب ہوگا۔ ع

مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

عالمی شہرت واحترام کے حامل تعلیمی ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم کی حیثیت سے مولانا محبّ اللہ لاری صاحب کا نام ان کی امتیازی حیثیت کی حامل صفات کے ساتھ ان کی حیات اور دور اہتمام میں بھی کانوں میں پڑتا رہا، لیکن ان سے بالمشافہہ گفتگو کی سعادت حاصل نہ ہوسکی۔ جس کی دو بنیادی وجہیں رہیں:

اول خود مولانا کی ''کام سے کام رکھنے'' کی خو، کہ وہ کام میں یقین رکھتے ہوئے اس کی تشہیر سے اس درجہ گریزاں رہتے تھے کہ ایک سربراہ کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں اور اپنے طلبہ کے سامنے بھی ''اپنے کارناموں'' کے اظہار وبیان کو باعث عار جانتے تھے۔ وہ ندوہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی جوہر شناس نگاہوں کا انتخاب بن کر آئے اور حضرت مولانا کے رفیق درس ہونے کی وجہ سے ان کے اعتماد واحترام کے حق دار بن کر رہے۔ اور اس اعتماد واحترام کو انھوں نے کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے ندوہ کے چوبیس برسوں پر محیط دور اہتمام میں ہر دل عزیز بن کر رہے۔ طلبہ واساتذہ اور دیگر

کارکنان ہی نہیں بلکہ ندوۃ العلماء سے کسی بھی انداز سے وابستگی رکھنے والے تمام ذمہ داران بھی ان سے پوری طرح مطمئن اور خوش رہے —— کیوں کہ انہیں کام کرنے اور کام لینے کا بھرپور وخوشگوار سلیقہ حاصل تھا —— ان سب کے باوجود میرے جیسے ''غیر ندوی'' کو وہ کبھی شہر کی کسی مجلس یا اسٹیج پر نظر نہیں آئے۔ جب کہ ان کے ماتحت اور ان کے شاگرد برابر نظر آتے رہے۔

مولانا مرحوم سے میری ذاتی ناواقفیت کی دوسری وجہ یہ بھی رہی کہ ان کے قیام لکھنؤ کے دوران یا تو بسلسلۂ حصول تعلیم میرا قیام لکھنؤ کے باہر رہا، یا پھر ایک ایسے بے شعوری کے دور میں تدریسی خدمات سے وابستہ ہوکر لکھنؤ میں قیام رہا کہ شخصیات کو پرکھنے اور ان سے استفادہ کی اہمیت کا احساس ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے اہتمام کے دوران میرا ندوۃ العلماء جانا آنا بھی بس کبھی کبھار، اور وہ بھی حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی بارگاہ میں حاضری تک ہی ہوا کرتا تھا —— ہاں یہ ضرور ہے کہ مولانا ممدوح کی اخفائے حال کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کے حسن انتظام، ضبط اوقات، اور قائدانہ صلاحیتوں کی باتیں وقتاً فوقتاً میرے کانوں تک بھی پہنچ جایا کرتی تھیں۔ اور ندوہ جیسے اہمیت کے حامل تعلیمی وتربیتی ادارہ کے کامیاب وباکمال مہتمم کی حیثیت سے ان کا ''غائبانہ احترام'' میرے دل میں بھی رہا۔

مولانا محبّ اللہ لاری مرحوم کی اپنی ذاتی صلاحیتیں وکمالات اپنی جگہ، لیکن یہ بالکل واضح اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منصب اہتمام پر فائز ہوکر بہت ہی خوبی کے ساتھ اس منصب کا حق ادا کرنے اور لگ بھگ ربع صدی کے دورانیہ میں اپنے بڑوں، اپنے ہم سروں، اور اپنے خردوں کو ہر طرح مطمئن رکھنے میں کامیابی حاصل کرنے نے ان کی شخصیت میں چار چاند بھی لگائے اور ندوی برادری کے ایک بڑے حلقہ کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور بھی کیا۔

اس کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت بھی کر رہا ہوں کہ ان کا دورِ اہتمام ان کی مادرِ علمی کے لئے بھی اس کے وقار میں اضافہ کا ذریعہ بنا کہ اس کا ایک فرزند جب اس ادارہ کا سربراہ بن کر منصب اہتمام پر فائز ہوا تو وہ صرف ایک عالم دین، یا دیسی الفاظ میں ''مُلّا'' نہیں تھا، بلکہ اس عالمی شہرت وعزت کے حامل ادارہ میں آنے والی شخصیات سے بوقت ضرورت اردو اور عربی کے ساتھ ہی انگریزی زبان میں بھی بے تکلف گفتگو کر کے اپنے ادارہ کے مقاصد وخدمات کا براہ راست اور ''بلاواسطہ وترجمانی'' تعارف کرا کے اپنے آنے والے مہمانوں کو حیرت بداماں بھی کرسکتا تھا—— اور میری محدود معلومات کے مطابق اس اعتبار سے یہ ندوہ کا ''مثالی دورِ اہتمام'' تھا؟۔

مولانا لاری مرحوم نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیمی فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں باقاعدہ داخلہ لے کر وہاں سے ۱۹۳۶ء میں پولیٹیکل سائنس میں ایم-اے کیا تھا، جس کا لازمی اثر یہ تھا کہ عملی طور پر سیاسی سرگرمیوں میں کبھی حصہ نہ لینے کے باوجود ملکی وعالمی سیاست پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ عالمی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لئے انگریزی کے کسی اخبار کا روزانہ پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔

آج کے دور میں علمی ومعاشی رجحانات وضروریات نے بہت بڑی تعداد میں ایسے فضلائے مدارس پیدا کر دیئے ہیں جو عصری علوم کے کالجوں و یونیورسٹیوں کی اسناد کے حامل ہو کر ان علوم میں بھی دست گاہ رکھتے ہیں، لیکن کم وبیش ایک صدی قبل ایسے باحوصلہ افراد کم ہی بلکہ خال خال ہی ہوا کرتے تھے جو دینی درس گاہوں سے باقاعدہ اسناد حاصل کرنے اور علوم اسلامیہ وعربی زبان میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد علوم عصریہ، بہ طور خاص انگریزی زبان پر قدرت حاصل کرنے کی غرض سے کالجوں ویونیورسٹیوں کی طرف متوجہ ہوئے ہوں—— اور پھر ان علوم پر دسترس حاصل کرنے، نیز عصری جامعات

سے ڈگریاں حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ ''اپنی اصل'' یعنی دینی مدارس اور ان میں حاصل کردہ علوم دینیہ ہی سے وابستہ رہ کر اسلام کے آفاقی پیغام اور اس کی بے مثال تعلیمات کو ان حلقوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے ہوں جن کا دینی مدارس اور دینی حلقوں سے کوئی ربط ورشتہ نہ ہو؟۔

راقم الحروف اپنے محدود علم وخبر کی بنیاد پر اس دور کی صف علماء سے ایسی دو مثالی شخصیتوں کا نام لے سکتا ہے:-

ایک مولانا سعید احمد اکبرآبادی، اور دوسرا مولانا محبّ اللہ لاری!۔

مولانا محبّ اللہ لاری ایک کامیاب منتظم، ایک باسلیقہ عربی، اور دینی و عصری علوم کے جامع ہونے کے ساتھ ہی قلم کے بھی دھنی تھے۔ انہوں نے کم لکھا، لیکن جو کچھ اور جس موضوع پر لکھا اسے قدر وقیمت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور عوام ہی نہیں، اہل علم کی طرف سے بھی اس کی پذیرائی ہوئی۔ ان کی سب سے اہم تحریر اسلامی نظام مملکت پر عربی زبان کی بہت ضخیم اور مفصل کتاب ''النظم الاسلامی'' کا نہایت ہی سلیس اور رواں ترجمہ شمار کی جاتی ہے، جو انہوں نے اپنے درسی ساتھی جناب مولانا رئیس احمد جعفری صاحب کی فرمائش و اصرار پر کیا تھا اور مولانا موصوف ہی نے اپنی خصوصی نگرانی میں کراچی (پاکستان) سے شائع کرایا تھا اور اس کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ

> ''زیر نظر عربی کتاب کا ترجمہ تقریباً نو دس سال ہوئے محبّ اللہ نے کیا تھا، ترجمہ تکمیل پاتے ہی میرے پاس بمبئی پہنچ گیا اس تصریح کے ساتھ کہ.......... سپردم بہ تو مایۂ خویش را! کراچی میں آنے کے بعد اس کتاب کا دوسرا ترجمہ نظر سے گذرا جو ہندوستان میں شائع ہوا ہے لیکن اہل نظر اور ارباب علم ان ہر دو تراجم کے دیکھنے کے بعد یقیناً محسوس کریں گے کہ زیر نظر ترجمہ

اپنی صحت، افادیت، معقولیت اور کاملیت کے اعتبار سے کہیں
بلند و برتر ہے۔''

ان تمام خوبیوں کے ساتھ ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کے لئے وہ بھرپور طور پر کوشاں رہتے۔ ان کے طلبہ نے ان کے ذوق عبادت کا حال یوں بتایا کہ ہر نماز کی ادائیگی کے لئے سب سے پہلے مسجد پہنچنے والے مولانا ہی ہوتے تھے، بسا اوقات تو مسجد میں ان کی حاضری اذان سے بھی پہلے ہو جاتی تھی۔ ان کے تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ دو قلم رکھتے تھے، دارالعلوم کے کاموں میں استعمال کے لئے ایک قلم، اور اپنی ضروریات کے لئے استعمال کیا جانے والا دوسرا قلم اور روشنائی۔ وہ مسجد میں حاضری کے لئے ٹوپی اور چپل بھی دوسری رکھتے تھے اور مسجد سے واپسی کے بعد اتار کر رکھ دیتے تھے۔

حقوق العباد کے پاس ولحاظ کے سلسلہ میں ان کے دور کے ایک ندوی عالم نے خود مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ کسی غلط اطلاع کی بنیاد پر مولانا کے قلم سے ان کا کھانا ایک ہفتہ کے لئے مدرسہ سے بند کر دیا گیا۔ بعد میں ندوہ کے ایک سینئر استاذ مولانا شفیق الرحمٰن ندوی صاحب مرحوم نے مہتمم صاحب کو میری بے قصوری اور غلط اطلاع کی بنیاد پر مہتمم صاحب کی غلط فہمی کی اطلاع دی تو مہتمم صاحب تڑپ اٹھے اور مجھے بلا کر مجھ سے اس وقت تک بار بار معافی مانگتے رہے جب تک میں نے اپنی زبان سے انہیں معاف کر دینے کی بات نہیں کہہ دی۔

اسی طرح ان ہی عالم صاحب نے اپنے سے وابستہ ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا کہ ایک مرتبہ موسم برسات میں مولانا کا چھاتا غلط فہمی کی وجہ سے بدل گیا۔ مولانا کو جب اس کا احساس ہوا تو انہوں نے ان ہی طالب علم صاحب کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ نماز کے بعد مسجد میں اعلان کریں کہ غلط فہمی کی وجہ سے مہتمم صاحب کا چھاتا کسی صاحب سے بدل گیا ہے۔ جن صاحب کا یہ چھاتا ہو وہ مہتمم صاحب سے مل کر اسے حاصل کر لیں۔

حسب الحکم ان طالب علم صاحب نے نماز عصر کے بعد مسجد میں یہ اعلان کر دیا، مگر اس اعلان کے باوجود کوئی چھاتا حاصل کرنے کے لئے مہتمم صاحب کے پاس نہ پہنچا۔ دوسرے دن مہتمم صاحب نے ان طالب علم کو طلب کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تم تو بس ایک مرتبہ اعلان کر کے خاموش ہو گئے، اب مسلسل پانچوں نمازوں کے بعد یہ اعلان کرو، ممکن ہے کہ چھاتے کا مالک ہر نماز میں نہ آتا ہو اور اسے اس اعلان کی خبر نہ ہوئی ہو؟۔

مولانا کی یہ بے چینی اس خیال سے تھی کہ ممکن ہے کہ میرے چھاتے کے مقابلہ میں یہ چھاتا زیادہ قیمتی ہو، اور میں حق العبد کو تلف کرنے کا مجرم بن جاؤں ——— حالانکہ دونوں ہی چھاتے معمولی اور پرانے تھے۔

مولانا محبّ اللہ لاری صاحب مرحوم کی پاکیزہ اور لائق تقلید زندگی کے ان چند گوشوں کو ضبط تحریر میں لا کر جہاں ''لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو جانے'' کی وجہ سے مجھے مسرت ہے، وہیں میرے لئے یہ بات بھی باعث فرحت واطمینان ہے کہ اس ٹوٹی پھوٹی اور غیر مربوط تحریر کے ذریعہ میں مولانا مرحوم کے نواسے حکیم جاوید احمد صاحب (مالیگاؤں) کی فرمائش پوری کر سکا، جنہوں نے نہ جانے کیا سوچ کر اور کس جذبہ سے مولانا مرحوم پر شائع کی جانے والی کتاب میں مشاہیر اہل علم وقلم کے ساتھ میری تحریر کو شامل کئے جانے کی ضرورت محسوس کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حکیم صاحب موصوف کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور مولانا لاری مرحوم کو اپنے شایان کرم مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

بھائی صاحب (پروفیسر عبدالحی فاروقی مرحوم)

بھت لگتا تھا جی ان کی سنگت میں

۲؍ستمبر ۲۰۱۴ء کو لگ بھگ ۱۵: ۱۰؍بجے شب میں جب بھائی صاحب (پروفیسر عبدالحی فاروقی مرحوم) کے اس دار فانی سے کوچ کرنے کی اطلاع ملی تو اچانک یادوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ ویسے یہ خبر کوئی غیر متوقع نہ تھی۔ کم و بیش ایک برس سے تو وہ اس حال میں تھے کہ ذہن کسی وقت بھی اس خبر کو سننے کے لئے آمادہ ہو چکا تھا۔ تاہم حسرتوں اور نہ ختم ہونے والی آرزوؤں کی اس دنیا میں جب بھی اور جس عمر میں بھی ہو، کسی اپنے کی جدائی غمگین کر دیتی ہے ——اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ ابھی ایسا نہ ہوا ہوتا؟ فیاحسرتا علی العباد۔

بھائی صاحب ایک بھرپور اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد کم و بیش ۸۷ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ میں اپنے چار حقیقی بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے ناطے ان کا بھائی صاحب بنا۔ لیکن میرے چچا بابا کی اولاد میں مشترکہ و متفقہ طور پر بھائی صاحب تو پروفیسر عبدالحی فاروقیؒ ہی کو کہا گیا، اور ہم میں سے کوئی بھائی بہن جب بھائی صاحب کی نسبت سے بات کرتا تو فوراً ذہن ان ہی کی طرف متوجہ ہوتا۔

وہ بہت سج دھج کے ایک اصول پسند انسان تھے اور انہیں اپنے ''بھائی

صاحب'' ہونے کا احساس دلانے کا ہنر خوب آتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خشک اور رعونت پسند رہے ہوں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاندانی اقدار و مجلسی آداب کی پوری رعایت کے ساتھ مزاح کو برتنے اور اپنے خردوں کے لئے تفریح و دل بستگی کا سامان کرنے کا سلیقہ بھی انہیں آتا تھا۔ بس بات اتنی تھی کہ اپنے بڑوں کے ادب و احترام پر انہیں جس قدر اصرار تھا اپنے خردوں سے اسی قدر احترام کے معاملہ میں وہ حساس تھے۔

یوں تو ہمارے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے حضرت امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے فرزند اکبر مولانا عبدالغفور صاحب مرحوم کے پسر حضرت مولانا محمد عبدالاول فاروقیؒ تھے۔ لیکن اول تو میری اور ان کی عمر کا فاصلہ اتنا تھا کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے بھی مجھ سے عمر میں بڑے ہیں، مزید یہ کہ ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ کے باہر خصوصاً سلطان پور میں گذرا جہاں انہوں نے ایک بڑا اور بافیض مدرسہ ''جامعہ اسلامیہ'' قائم کیا اور اسے پروان چڑھایا۔ وہ جب مستقل قیام کی غرض سے لکھنؤ آئے تو کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے تعلیمی سفر کے سلسلہ میں کئی برس تک میرا قیام لکھنؤ کے باہر رہا۔ اگرچہ ۱۹۷۰ء کے بعد ان کی بافیض و مشک بار شخصیت سے بھی بہ قدر ظرف فیض حاصل کرنے کے مواقع ملے، لیکن وہ بھائی بھائی سے زیادہ باپ بیٹے کے جذبہ سے؟——

لیکن بھائی صاحب (عبدالحی فاروقی صاحب مرحوم) کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ مجھے غیر شعوری عمر سے لے کر شعوری عمر تک ہر جگہ اور ہر محفل میں ''جان محفل'' بنے نظر آئے۔ مجھے ان کا دور طالب علمی بھی یاد ہے، پھر ''سنی ہائیر سکنڈری اسکول'' میں ایک استاذ کی حیثیت سے ملازمت کا دور بھی یاد ہے، اور اپنے والد ماجد مولانا عبدالمومن فاروقی مرحوم کی وفات کے بعد دہلی منتقل ہونا اور مختلف مراحل و ملازمتوں سے گذرتے ہوئے ''جامعہ ہمدرد'' کا آخری پڑاؤ اور وہاں سے بہ حیثیت پروفیسر شعبۂ دینیات سبکدوش ہونے تک اور اس کے

بعد سے دم آخر تک کے بیشتر و لائق ذکر واقعات سے مجھے پوری باخبری ہے۔

بھائی صاحب مرحوم کے تعلیمی سفر کا آغاز بھی مدرسوں اور وہاں کی تعلیم ہی سے ہوا تھا اور حفظ قرآن مجید کے لئے ان کا داخلہ ''مدرسہ عالیہ فرقانیہ'' میں کرایا گیا تھا لیکن ان ہی کے بیان کے مطابق اس وقت کے عمومی مزاج کی کچھ بے جا سختیوں کی وجہ سے مدرسہ کی تعلیم سے ان کا جی اچاٹ ہوگیا تو اس وقت کے خاندانی ماحول میں ایک بڑا اور اہم فیصلہ لیتے ہوئے ان کے والد ماجد مرحوم نے عصری تعلیم کی درس گاہ یعنی اسکول میں داخل کر دیا۔ اور بھائی صاحب نے اپنے والد مرحوم کے اس فیصلہ کو اس طرح درست و لائق تحسین کر دکھایا کہ اس وقت تک ہمارے خاندان میں عصری علوم کی سب سے اعلیٰ سندیں امتیاز کے ساتھ انہوں نے حاصل کیں، انہوں نے ایم-اے (معاشیات) اور پھر ایم-اے (عربی) کی ڈگریاں حاصل کیں اور دوسرے امتحان میں تو انہیں لکھنؤ یونیورسٹی نے گولڈ میڈل سے سرفراز کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ''پٹری'' کی اس تبدیلی کے باوجود بھائی صاحب کی وضع قطع اور لباس میں سرمو کوئی انحراف نہیں آیا، اور بہت سے لوگ انہیں اس وضع میں دیکھ کر اور خاندانی نسبتوں سے مولانا عبدالحی صاحب ہی کہتے رہے۔ ان کی دین پسندی اور صالح اقدار سے وابستگی کا اثر ان کی اولاد پر بھی ظاہر ہوکر رہا، اور ان کے چاروں بیٹے اپنی وضع قطع، رہن سہن، اور فرائض دینی کے حوالوں سے باقاعدہ مولوی اور عالم ہی نظر آتے ہیں، جب کہ بڑے بیٹے عبدالملک فاروقی سلّمہٗ (فاضل دیوبند) کے علاوہ تینوں بیٹے عصری علوم کی اعلیٰ سندات حاصل کرنے کے بعد بہت باعزت وکامیاب زندگی گذار رہے ہیں اور انہوں نے ایک دن بھی کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے، مگر ان میں سے کوئی بھی اپنے سب سے بڑے بھائی کے ساتھ کھڑے ہوکر ان سے الگ نظر نہیں آتا و ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

میرا اپنا ذاتی تاثر یہ ہے کہ بھائی صاحب مرحوم نے اپنا ''آئیڈیل'' تو اپنے والد ماجد کو قرار دیا تھا لیکن انہیں اپنے چچاؤں میں سب سے زیادہ ذہنی، فکری، اور علمی مناسبت میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم فاروقی صاحب مرحوم سے تھی، جن کے پاس وہ اپنے قیام لکھنؤ سے لے کر قیام دہلی تک برابر آتے اور اکثر ان کی یہ ملاقات کئی کئی گھنٹوں تک جاری رہتی۔ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے اسلاف اور خاندانی بزرگوں کے احوال اور ان کی خدمات، نیز ''تحریک مدح صحابہؓ'' کے سلسلہ میں علمی وتاریخی سوالات کرتے اور والد ماجدؒ کے جوابات سے اپنی تشفی کا سامان کرتے۔ خصوصاً اپنی معرکہ آرا تصنیف ''امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ — حیات و خدمات'' کی ترتیب وتسوید کے دوران تو بسا اوقات وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھتے اور اہم امور کو باقاعدہ اپنی یادداشت کے لئے ضبط تحریر میں لاتے۔

یہ بھی ایک خوشگوار اتفاق ہوا کہ بھائی صاحب کی سب سے بڑی بیٹی کا عقد میرے چھوٹے بھائی عبدالولی فاروقی سے ہوگیا —— اور اس کے بعد سے والد ماجدؒ کے دم آخر (۱۹۹۴ء) تک تو اس مناسبت و چاہت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

بھائی صاحب کم وبیش عمر میں مجھ سے ۱۵؍سال بڑے تھے۔ اس کے باوجود ان کے چھوٹے بھائیوں میں غالباً سب سے زیادہ ان سے بڑھ چڑھ کر میں ہی بات کرلیا کرتا تھا۔ میرے ٹوٹے پھوٹے لکھنے پڑھنے کے کام کے وہ بڑے قدردان تھے، کیوں کہ وہ خود بھی مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ مستقل تصنیف و تالیف کی شکل میں متعدد مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہندوپاک کے مختلف جرائد ورسائل میں شائع شدہ ان کے وقیع مضامین اور علمی وادبی سمیناروں میں پیش کئے جانے والے مقالات ان کے اس ذوق کے آئینہ دار اور وافر ثبوت ہیں۔ میری ادارت میں ۱۹۷۷ء سے شائع ہونے والے

رسالہ ''ماہنامہ البدر'' کا وہ بہت پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتے۔ اور بسا اوقات اپنے پسندیدہ مضامین پر اظہار رائے کرتے ہوئے میری خوب خوب حوصلہ افزائی کرتے۔

میری کوئی بھی نئی کتاب چھپ کر آتی تو میں بھائی صاحب کو اپنا باشعور قدردان سمجھ کر پیش کرتا اور وہ میری بھرپور ہمت افزائی کرتے۔ اور لکھتے پڑھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اسے آپ میرے مزاج کی فرسودگی سے تعبیر کیجئے یا پھر ''حسن انتخاب'' سے کہ جس ماحول اور جس طرز پر میری پرورش و تربیت ہوئی اس کا اثر یہ ہوا کہ بچپن ہی سے میرا جی اپنے ہم عمروں و ہم سروں سے زیادہ اپنے بڑوں میں لگا، اور اس کا ایک بڑا فائدہ مجھے یہ تو مل ہی گیا کہ بہت سی اچھی چیزیں مجھے پڑھائی سے نہیں بلکہ ''کڑھائی'' سے حاصل ہوگئیں ـــــ اسی ''افتاد طبع'' کے نتیجہ میں میرا جی تو بھائی صاحب کی سنگت میں لگتا ہی تھا، خود بھائی صاحب کو بھی مجھے اپنے پاس بٹھا کر اپنی سنانے اور میری سننے میں مزہ آتا تھا۔ بیٹی کی شادی کے بعد سے بھائی صاحب جب دہلی سے لکھنؤ آتے تو ان کا قیام اپنے داماد یعنی برادرم عبدالولی فاروقی ہی کے گھر میں ہوتا۔ اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کئی مرتبہ اس قیام کی مدت ہفتوں پر مشتمل رہی۔ اس دوران اکثر کئی کئی گھنٹے میں ان کے ساتھ گذار دیتا اور ہم دونوں میں سے کسی کو اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی دوران گفتگو وہ کرید کرید کر لکھنؤ اور کاکوری کے افراد خاندان کے احوال کی بھی مجھ سے جانکاری لیتے۔ کیوں کہ میرے والد ماجدؒ کی طرح ان کو بھی افراد خاندان کی خبر گیری میں ایک خاص لذت ملتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ان کے لمبے قیام کے دوران ملاقات میں دو ایک دن کا ناغہ ہو جاتا تو وہ خاص طور پر کسی بچہ کو بھیج کر مجھے بلواتے اور اپنے خاص انداز میں شکوہ کرتے کہ ''کہاں تھے بھائی! میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا''۔ میرے والد ماجدؒ کی وفات کے بعد کبھی کبھی ان کو بڑے پرسوز انداز میں یاد کرتے اور کہتے کہ

''چچا جان نے ہم لوگوں کے ساتھ حقیقی اولاد کا سا برتاؤ کیا، اب کہاں ایسے وضعدار لوگ؟''۔

خود بھائی صاحب کی وضع داری کا حال یہ تھا کہ موقع ملنے اور صحت کے متوازن ہونے کی صورت میں وہ برابر اپنے قیام کے دوران لکھنؤ ہی نہیں بلکہ کاکوری کے اعزہ واقربا سے ملاقات اور احوال طلبی کے لئے جاتے ـــــ یہی نہیں، بلکہ اپنے، اپنے والد اور دادا کے اہل تعلق سے بھی رابطہ قائم کرتے اور موقع ملنے پر کبھی ان کے گھر خود چلے جاتے اور کبھی انہیں اپنے پاس بلا کر رشتے اور تعلق کی تجدید کرتے ـــــ ایسے احباب میں چکمنڈی کے متعدد متعلقین و متوسلین کے علاوہ خصوصی طور پر بھائی نسیم الدین صاحب (پاٹا نالہ) اور الحاج محمد احمد خاں ادیب صاحب (بلوچ پورہ) اور مولانا محمد اسلم ندوی (ٹکیت گنج کنڈہا) شامل ہیں۔ اپنے ننیہال اور اب سمدھیانے کے رشتے داروں میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب سے ملاقات کو بھی وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔

بھائی صاحب مرحوم نے اپنے چچا جان یعنی میرے والد مولانا محمد عبدالحلیم فاروقیؒ کی یاد میں ماہنامہ ''البدر'' کے خصوصی شمارہ میں جو مضمون لکھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے چچا کے حوالہ سے ایک شعر درج کیا تھا ـــــ آج بھائی صاحب مرحوم کی یاد میں یہ چند بے ربط سطور لکھتے ہوئے بالکل اسی جذبہ سے وہی شعر درج کر کے میں اپنی بات ختم کر رہا ہوں کہ ؎

منزلوں کے سہارے گئے ☆ جو بڑے تھے ہمارے گئے

حق تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کاملہ فرمائے اور ان کی حسنات کو اپنانے کی ہم سب کو خصوصاً ان کی اولاد کو توفیق عطا فرمائے۔

سدا رہے نام اللہ کا

ملک زادہ صاحب کی انکساری وسادگی؟

میں کوئی شاعر نہیں، ادیب نہیں، ناظم مشاعرہ نہیں .... یعنی مرحوم ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کا تعارف جن حیثیتوں سے کرایا جاتا ہے، ان میں سے کوئی کمال میرے اندر نہیں کہ کسی حیثیت سے اپنے آپ کو ان سے منسوب کر کے ان کے بارے میں قلم اٹھا سکوں .... اس کے باوجود مجھے ان سے عقیدت کی حد تک محبت رہی، اور میں فخریہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ محبت ''یک طرفہ'' نہیں تھی، اسی لئے جب ''اتر پردیش اردو اکاڈمی'' کی ملک زادہ مرحوم سے منسوب خصوصی اشاعت کا اعلان ہوا تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ اردو ادیبوں کی اس محفل میں ''جا یا بے جا'' مداخلت کرتے ہوئے میں بھی شامل ہونے کی کوشش کروں گا؟

ملک زادہ مرحوم کی علمی وادبی حصولیابیوں کا اس مجلّہ میں ذکر ان لوگوں کے قلم سے آنے کی پوری توقع ہے جنہیں ان موضوعات پر لکھنے کا حق واختیار حاصل ہے اور جن کے لکھے ہوئے کو اعتبار واعتماد کا درجہ حاصل ہے، اور مجھے پوری طرح اطمینان ہے کہ اگر اس پہلو سے کوئی کمی وتشنگی رہ گئی تو اس مجلّہ کے خصوصی مہمان مدیر اور میرے انتہائی مخلص کرم فرما جناب انور جلال پوری صاحب پوری کردیں گے جن کی منجملہ سعادت آثاریوں اور خوش بختی کے ایک یہ بھی ہے کہ ذاتی شہرت وعزت، اور حلم ووقار کے درجۂ کمال پر فائز ہونے کے

باوجود متعدد بڑی بڑی محفلوں اور باوقار شخصیات کی موجودگی میں انہیں میں نے انتہائی عجز وانکسار کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہوئے سنا کہ میں ملک زادہ منظور صاحب کا شاگرد ہوں جس پر مجھے فخر ہے اور میں مسرت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا اور آج میں جس مقام پر ہوں اس میں میرے استاذ محترم ملک زادہ منظور احمد صاحب کا بھرپور حصہ ہے۔

یہ تو ہوئی محترم انور جلال پوری صاحب کی ملک زادہ صاحب مرحوم سے محبت وعقیدت کی بات، لیکن لطف یہ ہے کہ ملک زادہ صاحب نے بھی اپنے اس شاگرد کے قد وقامت کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ جواب میں ملک زادہ صاحب نے بھی انور صاحب کو اپنے شاگرد کی حیثیت سے مخاطب کیا ہو، یا اپنی تقریر وخطابت کے دوران انور صاحب کو ''اپنا چھوٹا'' گردانے کی کوشش کی ہو............ اور بس میں ملک زادہ صاحب سے قرابت وقدرے قربت وواقفیت کے حوالہ سے ان کی اسی روش کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جسے تواضع وانکساری سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے مخلوق کے ساتھ ہی خالق بھی بہت پسند فرماتے ہیں اور تواضع کرنے والے کو بدلے میں رفعتیں وعظمتیں عطا کرتے ہیں۔

مشہور کہاوت ہے کہ ''پھل دار درخت کی شاخیں ہی جھکی رہتی ہیں'' اور واقعہ بھی یہی ہے کہ سربلند وسرافراز لوگوں کی طرف سے تواضع دلوں کو چھوتی اور نظروں کو بھاتی بھی ہے اور مؤثر ولائق تقلید بھی قرار پاتی ہے، جیسا کہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

کہ انکساری تو سربلند وسرفراز لوگوں کو ہی زیب دیتی ہے۔ بھکاری اگر تواضع وانکساری کرتا ہے تو یہ اس کی عادت ومجبوری ہوتی ہے۔

سب ہی اس بات کو جانتے ہیں کہ ملک زادہ منظور احمد صاحب کو ان کی حیات ہی میں اعتراف وقبول اور عزت وشہرت کا وہ مقام حاصل ہو گیا تھا جو کم ہی لوگوں کے نصیب میں آتا ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کے معاصر ادیبوں وشاعروں کے درمیان انہیں امتیازی مقام عطا کرتا ہے کہ ان کے رشتے دینی حلقوں اور دینی و مذہبی شخصیات سے بھی اسی طرح استوار وخوشگوار رہے جس طرح ادبی حلقوں اور دین بے زار افراد، نیز دین فراموش اصحاب علم وقلم سے رہے۔ وہ اگر ملک وبیرون کی عظیم دانش گاہوں اور ادبی تنظیموں کی طرف سے منعقد ہونے والے پروگراموں میں ''شمع محفل'' بن کر شریک ہوتے اور ادب وشعر، نیز سماج وسیاست سے وابستہ عظیم شخصیات سے مربوط رہے۔ تو دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ عالیہ عرفانیہ لکھنؤ، خانقاہ کاظمیہ کاکوری وغیرہ جیسے دینی اداروں کے مختلف پروگراموں میں بھی نہایت فرحت وانبساط کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ نیز ممتاز دینی شخصیات مثلاً حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، اور حضرت مولانا اسعد مدنیؒ وغیرہ سے بھی انہوں نے اپنے عقیدت مندانہ ونیاز مندانہ رابطے قائم رکھنا ضروری سمجھا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ تو مجھ جیسے خرد درخرد سے ملتے تو محض دین اور علم دین کے احترام میں اپنے کو چھوٹا بنا لیتے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے روبرو سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے اجازت طلب کی اور یہ کہتے ہوئے اپنے ''بڑے پن'' کی لاج رکھی کہ کیا بتایا جائے، بری لت ہے۔ وہ مجھ سے ''میرے مطلب کی'' گفتگو کر کے نہ صرف میرے لئے فرحت و دلجوئی کا سامان کرتے بلکہ اکثر دینی مسائل کا استفتا کر کے دین سے اپنی فکری وقلبی وابستگی کا ثبوت بھی فراہم کرتے۔

معلوم بات ہے کہ مشاعروں کی نظامت کو ''اپنی اختراعات'' کے ذریعہ ملک زادہ صاحب نے ہی ''ایک فن'' کا مقام عطا کیا، اور درجنوں مشاعرے ان کی اس ''فن کاری'' کے ذریعہ کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ پھر ان کی

تقلید وتتبع میں اور بھی متعدد باکمال ناظم مشاعرہ پیدا ہوئے اور انہوں نے شاعروں کے دوش بدوش بلکہ بسا اوقات شاعروں سے بڑھ کر اپنی دلچسپ اور سحر انگیز نظامت کے ذریعہ شاعروں کو سامعین کی ''ہوٹنگ'' سے بچا کر کلام سنانے کے مواقع فراہم کئے اور مشاعروں کو کامیاب بنانے میں کلیدی کردار عطا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ملک زادہ صاحب کا یہ ''فن نظامت'' اپنے پورے نکھار کے ساتھ غزل کے مشاعروں ہی میں ظاہر ہوا اور اسی حوالہ سے اس کا تعارف بھی ہوا ....مگر ایسا نہیں کہ ان کا یہ فن غزل کے مشاعروں ہی میں محدود رہا ہو، بلکہ انہیں متعدد نعت ومنقبت کے مشاعروں، بلکہ سیرت ودیگر دینی عنوانات سے منسوب جلسوں میں ''دینی آداب'' کی پوری رعایت کے ساتھ شریک ہوتے اور ''فن نظامت'' کے جواہر بکھیرتے ہوئے میں نے خود دیکھا اور سنا ہے۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ ملک زادہ صاحب دینی حلقوں کی کوئی نمائندہ شخصیت تھے، بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ تمام تر آزاد خیالیوں اور پاپابیوں کے باوجود دینی قدروں، دینی حلقوں، اور دینی شخصیتوں کا بھی وہ بے حد لحاظ واحترام کرتے تھے اور خاندانی نسبت، فکری سعادت، نیز طبعی تواضع وانکساری کی جھلکیاں اس پہلو سے بھی ان کے اقوال وکردار میں نمایاں طور پر نظر آتی تھیں۔ ان کا ننہیال ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر کے محلّہ الہداد پور میں تھا اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ان کے رشتہ میں خالو ہوتے تھے، میرے چچا مولانا عبد المومن فاروقی مرحوم بھی اسی رشتہ سے ان کے خالو ہوتے تھے جو کہ حضرت مدنیؒ کے حقیقی ہم زلف تھے..........ایک مرتبہ میں نے ملک زادہ صاحب سے اس رشتہ کی کچھ تفصیل دریافت کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ حضرت مدنیؒ سے آپ کا کس طرح رشتہ ہے اور ان کی اہلیہ صاحبہ آپ کی والدہ صاحبہ کی کیسی بہن ہیں؟ جواب میں ملک زادہ صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان کی تواضع وانکساری، نیز دینی اقدار و دینی شخصیات کے سلسلہ میں جذبات واحترام

وعقیدت کا بہ خوبی علم ہو جاتا ہے............انہوں نے کہا تھا کہ ''بھائی رشتہ داری تو بہت قریب کی ہے، اور اس رشتہ کے علاوہ حضرت مدنیؒ سے خاندانی طور پر دوسرا رشتہ بھی ہے۔مگر مجھے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی ہے کہ مجھ جیسا ''آلودۂ عصیاں شخص'' ان پاکبازوں سے اپنا رشتہ بیان کرکے ان کی رسوائی کا سامان کرے، اس لئے جو لوگ اس بارے میں جتنا جانتے ہیں وہ جانتے ہیں، میں اپنی زبان سے اس سلسلہ میں کچھ کہنے سے احتیاط برتتا ہوں کہ وہ کیا تھے اور میں کیا ہوں؟''

ملک زادہ صاحب کی تواضع و انکساری کا ایک واقعہ تو میرے لئے ناقابل فراموش رہے گا............ یہ ۱۲ رفروری ۲۰۱۵ء کی بات ہے جب جے شنکر پرساد ہال، قیصر باغ، لکھنؤ میں میری نو مطبوعہ کتاب ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' کی رسم اجرا متعدد علماء وادباء کے ہاتھوں انجام پانا تھی۔احباب کی فرمائش واصرار پر پہلی مرتبہ میں نے اپنی کسی کتاب کے لئے رسم اجرا کی کوئی باقاعدہ تقریب کرانے کی ہمت کی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے میں نے فون پر ملک زادہ صاحب سے بھی درخواست کرتے ہوئے اپنی معذوریوں کے حوالہ سے جب اس بے لحاظی اور ان کے شایان شان دعوت نہ دے سکنے پر معذرت پیش کی تو انہوں نے اپنی واقعی بڑائی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا معذرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ تو آپ کا حق ہے اور آپ کی فرمائش پوری کرکے مجھے خوشی ہوگی۔اور پھر علالت ونقاہت کے باوجود نہ صرف شروع سے آخر تک اس تقریب کو اپنی شرکت سے معتبر بنایا، بلکہ اپنی تقریر میں میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھے کچھ اس طرح سراہا اور نوازا کہ میں اپنی بساط وحقیقت پر نظر کرکے شرمسار ہو گیا؟۔

اس تقریب کی نظامت میرے بچپن کے دوست اور مشہور شاعر رئیس انصاری کررہے تھے، جنہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مولانا

............صرف عالم دین ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے باقاعدہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرکے کئی مضامین میں ایم-اے کی ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔لکھنؤ یونیورسٹی سے انہوں نے اردو میں بھی ایم-اے کیا ہے اور یہ ملک زادہ منظور احمد صاحب کے شاگرد ہیں۔ (واقعہ یہ ہے کہ ملک زادہ صاحب جیسی عظیم شخصیت کی باقاعدہ شاگردی میرے لئے مایۂ افتخار ہوتی، لیکن چوں کہ میں نے ایم اے اردو ٹیچر کنڈیڈیٹ کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر کیا تھا اس لئے میں یہ سعادت حاصل نہیں کرسکا، اگرچہ میں ان کے فیض سے پوری طرح محروم بھی نہیں رہا) اب ملک زادہ کی عظمتِ کردار اور تواضع وانکسار پر نظر کیجئے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں مجھ سے اپنے ربط و رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ آج رئیس انصاری نے یہ انکشاف کرکے میرا سر فخر سے بلند کردیا کہ مولانا میرے شاگرد ہیں۔حالاں کہ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھ سے پڑھا ہے، اتنی طویل مدت میں اتنے شاگرد ہوئے کہ سب یاد نہیں ہیں لیکن ان جیسے لوگوں کا شاگرد ہونا............وغیرہ وغیرہ۔

میں کیوں کر اس تواضع وانکسار کے مثالی نمونہ کو فراموش کرسکتا ہوں کہ جس شخص کے شاگردوں کی طویل فہرست میں دانشوروں، ادیبوں، پروفیسروں اور عالموں کی ایک لمبی قطار ہو اور جس کی شاگردی پر ناز کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہو، اس کا مجھ جیسے بے بضاعت کا شاگرد کی حیثیت سے ذکر سن کر اپنی ''حیثیت عرفی'' کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے سلسلے میں ایسے ''بلند کلمات'' کہنا، میری حوصلہ افزائی اور مجھے اعتبار عطا کرنے ہی کے لئے تو تھا؟

فکروفن اور علم وادب کے حوالوں سے اوپر اٹھ کر بلندی کردار کی ایسی مثال اتنی قد آور شخصیتوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے............اور بس یہی ہے ملک زادہ مرحوم کا امتیاز۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

انور جلالپوری
ایک طرح دار شخصیت

دنیا کی سب سے سچی لیکن سب سے کڑوی حقیقت کا نام موت ہے —— جو سچی تو اتنی کہ اپنے خالق و مالک کے وجود کا انکار کردینے والا ایک ملحد و دہریہ بھی موت کا انکار نہیں کرسکتا، لیکن اسی کے ساتھ کڑوی اتنی کہ جانکنی و نزع کے عالم میں بھی سانس کی ڈور ٹوٹنے سے پہلے کوئی موت کا لفظ سننا اور اس کی نسبت اپنے کسی چہیتے کی طرف کیا جانا گوارہ نہیں کرتا؟ جب کہ ہوتا یہی آیا ہے کہ اس سچائی کو کڑوی گولی سمجھ کر بھی ہضم کرنا ہی پڑتا ہے۔

نئے عیسوی سال ۲۰۱۸ء کا آغاز ہوا تو میں ایک مقدس سفر پر ملک سے باہر ارض حرم میں تھا۔ پہلے مہینے کا دوسرا ہی دن تھا کہ اپنے ملک کی ایک عظیم شخصیت، رس بھری آواز اور ٹوٹ کے ملنے کے انداز سے ہر ملاقاتی کا دل جیت لینے والے انسان—— اور پھر منفرد لب ولہجہ کے شاعر، مترجم و مصنف، نیز مشاعروں کی نظامت میں اپنا سکہ چالیس برس سے زیادہ رواں دواں رکھنے والے اپنے قدرداں و کرم فرما جناب انور جلال پوری کی خبر وفات نے جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا —— اگر چہ برین اسٹروک کے بعد تشویش ناک حال میں

ہسپتال میں داخل کئے جانے کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی، اور جو تفصیلات علم میں آئی تھیں انہوں نے تشویش میں مبتلا کردیا تھا، لیکن وفات کی اطلاع ملتے ہی کم و بیش دو ہفتہ قبل ہی کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے آگیا جب میں انور صاحب کی اکلوتی بیٹی کی وفات پر تعزیت پیش کرنے کے لئے ان کے مکان پر گیا تھا۔ وہ مشرق کی بیٹی کو خاک مغرب کے حوالہ کرنے کے بعد دو روز قبل ہی لندن سے واپس آئے تھے۔ ان کے حزن وملال کے اثرات کو کچھ کم کرنے کی کوشش میں مجھے کامیابی بھی ملی تھی جس کا انہوں نے بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہوئے جب بے رنگ مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا تو مجھے اس احساس نے طمانینت بخشی تھی کہ نہ صرف ایک باپ کے زخمی دل پر مرہم رکھنے کی اپنی سی کوشش میں مجھے کچھ کامیابی ملی بلکہ ایک سدا بہار شخص کے حزن وملال کو کچھ وقفہ ہی کے لئے سہی میں نے ٹال کر کچھ ثواب ضرور کما لیا۔

دوران گفتگو میری اشاعت پذیر نئی کتاب ''یادوں کے جھروکوں سے'' کا بھی ذکر آیا، جس پر مرحوم انور صاحب نے بہت ہی پر مغز مقدمہ لکھ کر میری بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی۔ میں نے انہیں یہ بتاتے ہوئے کہ کتاب کی طباعت آخری مرحلہ میں ہے ان سے درخواست کی تھی کہ میری اس سے پہلے شائع ہونے والی کتاب ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' کی رسم اجراء کے موقع پر آپ کے و دیگر بڑوں کے ساتھ ہی پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب مرحوم بھی تھے جو اب ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اب اس نئی کتاب کی رسم اجراء کی تقریب میں آپ پر دوہری ذمہ داری ہوگی؟ تو انہوں نے بڑے انبساط و فرحت کے ساتھ اپنی روایتی انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ اس تقریب میں شرکت میرے لئے باعث سعادت ہوگی، بس طباعت کے بعد جلد ہی یہ تقریب کرلیجئے گا۔ میں ضرور شرکت کروں گا —— مجھے یاد نہیں کہ یہ

آخری جملہ کہتے ہوئے انہوں نے ''ان شاء اللہ'' کہا تھا یا نہیں؟ بہ ہر حال ہم غافل لوگ اپنے منصوبے بناتے رہے اور قدرت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا—— اور اب صورت حال یہ ہے کہ۔

دل میں یادِ غم بے کراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

مرحوم انور صاحب سے میرے تعلقات اور پھر قربت کی مدت کچھ بہت طویل نہیں ہے، اور پھر یوں بھی دیکھا جائے تو ہماری یہ قربتیں کچھ بے جوڑ سی لگتی ہیں؟ وہ ایک عالمی شہرت کے حامل ادیب و شاعر، مترجم و مصنف اور صاحب طرز ناظم مشاعرہ—— اور میں بس ایک سادہ سا مولوی اور وہ بھی ''مسجد و مدرسہ کی دوڑ'' تک محدود! مگر وہ جو مشہور صداقت ہے کہ دلوں پر کس کا زور چلا ہے؟ چند ملاقاتوں ہی میں وہ قریب سے قریب تر ہی نہیں ہوتے چلے گئے، بلکہ اللہ نے ان کی نظروں میں میرا کچھ ایسا بھرم بنا دیا کہ انہوں نے اپنی منظوم ''سیرت خلفائے راشدین'' پر مقدمہ لکھنے کے لئے نہ صرف میرا انتخاب کیا بلکہ اس نسبت سے کئی مرتبہ میرے غریب خانہ پر بھی آئے—— اور پھر جس جس طرح اپنی محبتوں کے ڈونگرے لٹائے اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا —— اور اب جب کہ قضا و قدر کے فیصلہ کے مطابق اس سرائے فانی میں ان کی ملاقات سے کچھ اس طرح محروم ہوا کہ نہ ان کی نماز جنازہ میں شرکت ہو سکی اور نہ ہی ان کی آخری منزل تک پہنچانے کا واجبی حق ادا کر سکا۔ تو اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہوں کہ۔

تم سے ملنا خوشی کی بات سہی
تم سے مل کر اداس رہتا ہوں

البتہ ان کی خبر وفات ایسے مقام اور ایسے سفر کے دوران ملی کہ حق تعالیٰ

سے ان کی مغفرت اور ترقی درجات کی بھیک مانگنے کی خوب خوب سعادت مل گئی —— اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کام کی بات یہی ہے جس کا موقع ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے حسن اخلاق کی وجہ سے انہیں عنایت کیا ہو؟

انور جلال پوری صاحب کی شخصیت اور فن پر ان کے قدرداں اور مرتبہ شناس لوگ لکھیں گے، اور پھر نہ یہ میرا میدان ہے نہ ہی مختصر تعارف کے ساتھ اس موضوع کا حق ادا کرنے کے لائق ہوں—— تاہم اپنے ذاتی تاثر کی روشنی میں ایک جامع بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک قدر شناس و شائستہ انسان تھے اور ہر شخص کو اس کے مرتبہ کے مطابق برتنے کا انہیں بہت سلیقہ تھا، جس کا مشاہدہ غیر رسمی نشستوں سے لے کر عوامی جلسوں و مشاعروں میں مجھے بھی متعدد مرتبہ ہوا، اور یہ دیکھ کر رشک ہوا کہ وہ ہر محفل کے لئے ''جان محفل'' بن جایا کرتے تھے۔

مشاعروں کی نظامت کو ایک فن کا درجہ عطا کرنے والی مشہور علمی و عالمی شخصیت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد مرحوم کو وہ برملا اور برسر محفل اپنا قابل احترام استاذ قرار دیتے تھے۔ اور یہ محض اس لئے کہ اس فن میں انہوں نے ملک زادہ صاحب سے اکتساب فیض کیا تھا، کیوں کہ انہوں نے ملک زادہ صاحب سے کسی درس گاہ میں زانوئے تلمذ تہ کر کے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود نہ صرف انہیں وہ اپنا استاذ کہتے بلکہ استاذ والا احترام بھی دیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کی وفات کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ان کے سلسلہ میں ایک یادگاری مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی ترتیب و تدوین کے لئے اکاڈمی کے اس وقت کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی کو انور جلال پوری صاحب سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آئی اور انہوں نے

باصرار یہ کام انور صاحب کے سپرد کیا جسے انہوں نے بڑی خوش دلی اور انہاک کے ساتھ انجام دیا، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے لئے خود بھی ایک طویل و پر مغز مضمون لکھا جو غالباً اس اشاعت کا سب سے اہم اور معلوماتی مضمون قرار پائے گا۔ چوں کہ وہ ملک زادہ صاحب مرحوم سے میری قرابت وقربت سے کچھ واقفیت رکھتے تھے اس لئے اس اشاعت کے لئے فرمائش واصرار کر کے مجھ سے بھی ایک مختصر تاثراتی مضمون لکھوا کر اسے شامل اشاعت کر کے ''یوسف کے خریداروں میں میرا نام درج کرانے'' کی بھی سعادت بخشی۔ انور صاحب کی شائستہ قدر شناسی کا یہ انداز ملک زادہ صاحب مرحوم کے علاوہ دیگر کئی لائق احترام شخصیات کے ساتھ بھی میرے مشاہدہ میں آیا—— اور اس نسبت سے مجھے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی صداقت بھی نظر آئی کہ مَنْ اَکْرَمَ اُکرِمَ یعنی جو دوسروں کی عزت کرے گا اسے عزت عطا کی جائے گی۔ میرا یقین ہے کہ انور صاحب کی مقبولیت و ہردل عزیزی میں ان کے قدر شناسی کے جوہر کا بڑا حصہ رہا ہے۔ انور جلال پوری کی پذیرائیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کی علمی و ادبی حیثیت کو عالمی سطح پر تسلیم بھی کیا گیا اور انہیں اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کے قدر دانوں وقدر شناسوں کے حلقہ میں مسلم وغیر مسلم، سیاسی و ادبی، عوامی وحکومتی، تمام حلقوں کی شخصیات قابل لحاظ تعداد میں شامل ہیں۔ اور یہ ان کی غیر معمولی وغیر رسمی مقبولیت ہی کی بات ہے کہ وفات پر کئی مہینے گذر جانے کے باوجود اب تک ملک و بیرون ملک میں تعزیتی جلسوں کے ذریعہ انہیں خراج عقیدت ومحبت پیش کئے جانے کا سلسلہ جاری ہے—— اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس مقبولیت میں سب سے زیادہ دخل اس بات کو ہے کہ انور صاحب ایک ایسے باظرف و بامروت اور متواضع انسان تھے جن کے اندر ''آدمیت'' کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی—— اور ان

ہی جیسے لوگوں کے لئے شاید کہنے والے نے کہا تھا کہ ؎

اک شخص کہہ رہا تھا سر دار چیخ کر
شہر مراد لٹ گیا انسان مر گیا

انور صاحب ہماری اس فانی دنیا سے اپنی خوشگوار یادوں کی مہک چھوڑ کر گئے—— جانا سب ہی کو ہے کیوں کہ ع

سدا باقی رہے نام اللہ کا

ڈھونڈھ ان کو اب چراغ رخ زیبا لے کر

دنیا سرائے فانی ہے، یہاں جو بھی آیا ہے اسے جانا ہے، ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، موت کا ہمیں کوئی معین وقت یا علامت پہلے سے معلوم نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ جیسے جملے ہمارے منھ سے وقتاً فوقتاً ادا ہوتے رہتے ہیں، ہمیں ان جملوں میں بیان کئے گئے مضمون ومفہوم کا یقین بھی ہوتا ہے......اس کے باوجود غفلتوں کے ایسے دبیز پردے ہماری آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں کہ کسی ''اپنے'' کی موت کی خبر پاکر ہم اس طرح چونکتے ہیں جیسے یہ کوئی خلاف توقع حادثہ ہوگیا ہو......اور پھر اس حوالہ سے کچھ وقت تک دنیا کی ناپائیداری اور اپنی موت کا بھی ''رسمی ذکر'' ......رہ کر پھر وہی غفلت............

ابھی گذشتہ ماہ کے اواخر میں چار اپنوں کی جدائی اور اس دنیائے فانی سے رخصتی پر اظہار تعزیت کر کے کچھ اپنی اور کچھ مرحومین کے پس ماندگان کے لئے تسلی کا سامان کیا ہی تھا کہ پندرہ دن کے اندر حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب، بھائی حفیظ نعمانی صاحب اور الحاج نور عالم علوی صاحب کی یکے بعد دیگرے وفات نے پے بہ پے مغموم وافسردہ کیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

دل کا تقاضا ہوا کہ مرحومین سے اپنے کچھ رشتوں اور اوصاف کا اختصار کے ساتھ بیان کر کے ان کے ورثاء سے تعزیت مسنونہ کرنے کے ساتھ ہی

اپنے جی کا بوجھ کچھ ہلکا کیا جائے۔

یہ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء دارالعلوم دیوبند کے دور طالب علمی کی بات ہے کہ حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحبؒ سے ان کے والد ماجد کے قائم کردہ کتب خانہ محمودیہ دیوبند میں پہلی ملاقات ہوئی، وہ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ فارسی میں استاذ ہونے کے ساتھ ہی ایک بڑے علمی کام ''تفہیم المسلم'' کی ترتیب وتسوید میں مشغول تھے۔ اگرچہ وہ میری کم عمری اور بہت کم علمی کے ساتھ ہی اس دارالعلوم ہی کے ایک ادنیٰ طالب علمی کا دور تھا جس کے مولانا ایک لائق ومقبول استاذ تھے، اس کے باوجود محض خاندانی نسبتوں کی بنا پر مولانا ایسی شفقت ومحبت کے ساتھ ملے کہ پھر بار بار ان سے ملنے کے لئے میری حاضری ہوتی رہی۔ مولانا کو اپنی بات مخاطب کی استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے سہل اور مرتب انداز میں پیش کرنے میں ملکہ حاصل تھا............ان کی یہ خوبی تقریر وتحریر دونوں میں نظر آتی ہے............عموماً ان سے بعد نماز عصر مختصر وقفہ کی ملاقات ہی ہوتی اور میری طالب علمی کی رعایت کرتے ہوئے وہ بیشتر پڑھنے پڑھانے ہی کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ متعدد کتابوں اور اس وقت کے اساتذہ سے استفادہ کے انہوں نے کئی ''گُر'' بھی بتائے جو میرے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوئے۔

غالباً میرے قیام دارالعلوم ہی کے دوران یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ صوبہ پنجاب کے مشہور شہر مالیر کوٹلہ میں مفتی کے منصب پر فائز ہو کر چلے گئے، میں دارالعلوم سے اپنی جیسی تیسی تعلیم مکمل کر کے اپنے وطن لکھنؤ واپس آ گیا...... اور کبھی کبھی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

اس کے بعد سے تادم واپسیں مولانا سے جلسوں اور سمیناروں کے اسٹیج پر بالمشافہ ملاقاتیں ہوئیں اور مالیر کوٹلہ پہنچ کر مولانا نے جو ''علمی سلطنت'' دارالسلام کے نام سے قائم کی، اس کی سرگرمیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر

مجھے استفادہ کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مرکز کے ترجمان کے طور پر دارالسلام ہی کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری کیا اور میرے رسالہ البدر سے اپنی طرف سے پہل کر کے تبادلہ شروع کر دیا اور تبادلہ ہی نہیں میری عزت افزائی یا حوصلہ افزئی کے لئے البدر میں شائع ہونے والے میرے مضامین وقتاً فوقتاً نقل کر کے دارالسلام میں شائع کرتے رہے..........اور اس واسطہ سے ہمارے رشتہ کو ایک بار پھر تحریک مل گئی، اگر چہ وہ ''قلمی'' رشتہ ہی رہا۔ مولانا نے اپنی متعدد تصانیف البدر میں تبصرہ کے لئے بھیجیں..........اور مجھے ان کی تحریروں سے مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہے۔

مولانا ہلال عثمانی مرحوم ایک ممتاز علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اپنے آباء صالحین کی علمی و تہذیبی روایات کے امین و محافظ بھی تھے۔ شکل وصورت اور لباس سے لے کر تخاطب و تعلّم اور بود و باش تک ہر چیز میں ان کی نسبی و طبعی شرافت کی جھلک نظر آتی تھی۔

برسوں سے کوئی براہ راست رابطہ و ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے ان کی علالت کی بھی کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی، بس اچانک ہی اخبارات کے ذریعہ انتقال پر ملال کی اطلاع ملی۔ حق تعالیٰ مغفرت کاملہ سے نوازے۔ آمین۔

حفیظ نعمانی: ایک صحافی، ایک انسان!

۹ر دسمبر کو ملک کے نامور ادیب وصحافی حفیظ نعمانی صاحب بھی ہماری اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حفیظ نعمانی مرحوم کو ان کی موجودگی ہی میں نہیں ان کی غیبت میں بھی میں نے ’’حفیظ بھائی‘‘ ہی کہا —— یہ اور بات ہے کہ اپنی خوش طبعی، خوش فکری، اور خوش اخلاقی کے ذریعہ انہوں نے اپنے آپ کو ’’بڑے بھائی‘‘ کے جنجال سے چھڑانے کی ہمیشہ کوشش کی۔

بلاشبہ حفیظ نعمانی اردو کے ایک ایسے بے باک، بے لوث، اور باوزن صحافی وتجزیہ نگار تھے جن کا متبادل وہمسر دور دور تک نظر نہیں آتا۔ حالات حاضرہ پر ان کی جتنی گہری نظر رہتی اسے اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنے کا اس سے بڑھ کر انہیں سلیقہ تھا۔ کوئی باذوق قاری ان کے دوچار مضامین یا اداریے پڑھ لیتا تو اسے حفیظ نعمانی کو پڑھنے کا چسکا لگ جاتا۔ حفیظ بھائی کی اخبارات سے وابستگی کسی ذاتی غرض یا معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے واردات قلبی کے اظہار یا اپنے ذہنی بوجھ کو تقسیم کر کے کچھ اپنے کو ہلکا کرنے اور کچھ دوسروں کی آنکھیں کھولنے کے لئے ہوا کرتی تھی۔ وہ اخبارات کے مالکان و مدیران کی کسی ’’پالیسی‘‘ یا بالفاظ دیگر ’’مصلحت‘‘ کی قید سے اپنی آزادی اور ’’اظہار رائے‘‘ پر کسی قسم کا قدغن نہ لگنے کی منظوری حاصل کئے بغیر کسی اخبار سے وابستگی گوارہ نہیں کرتے تھے —— یہی وجہ ہے کہ کسی ایک اخبار سے ان کی وابستگی

بہت طویل نہیں ہو پاتی تھی، اور جوں ہی حفیظ بھائی یہ محسوس کرتے کہ اخبار کے مالک یا مدیر کو یہ ’’غلط فہمی‘‘ ہونے لگی ہے کہ اخبار اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے اور حفیظ بھائی کی تحریریں اخبار کی بقا کے لئے ناگزیر نہیں رہ گئی ہیں —— حفیظ بھائی خاموشی کے ساتھ اس اخبار سے علیحدہ ہو کر اپنا ہاتھ اور اپنا قلم اس ’’نوآموز طالع آزما‘‘ کو تھما دیتے جو دیر سے اسی ’’روز سعید‘‘ کی آمد کا منتظر ہوتا تھا، اور حفیظ بھائی ’’اپنی شرائط‘‘ بلکہ خود ان کے ہی اس راقم الحروف سے کہے گئے الفاظ میں صرف ایک ’’دُم پر پیر رکھنے کی شرط‘‘ کے ساتھ پوری سچائی اور لگن کے ساتھ اس اخبار کو بڑھانے اور قارئین کو اس کا عادی بنانے میں جٹ جاتے۔

حفیظ بھائی نے ’’تحریر فروشی‘‘ کا پیشہ کبھی نہیں اپنایا، اپنے اخبار میں لگے تو وہ گھاٹے پر چلتا رہا اور ’’اپنا شوق‘‘ پورا کرتے رہے۔ دوسروں کے اخباروں سے وابستہ ہوئے تو کسی اجرت کے بغیر صرف ’’دُم پر پیر رکھنے‘‘ کی شرط کے ساتھ؟

حفیظ نعمانی کھری بات کہنے اور کھری بات لکھنے کے عادی تھے اور اپنی اس ادا کو انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک نبھایا —— اس کے باوجود ان کی تحریر اور اس سے زیادہ ان کی گفتگو میں ایک ایسی چاشنی ہوتی تھی کہ ان کو پڑھنے اور سننے والا کھو کر رہ جاتا تھا۔ وہ جس پر جرح وتنقید کرتے اگر وہ ان کی پوری بات سن لیتا یا پڑھ لیتا تو اگر اعتراف نہیں تو خاموش رہنے پر تو مجبور ہو ہی جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے مستقل طور پر ناراض رہنے والوں کی تعداد میرے خیال میں انگلیوں پر شمار کئے جانے کے لائق بھی نہ رہی ہوگی۔

مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ حفیظ نعمانی کسی فرشتہ کا نہیں، بلکہ ایک انسان کا نام تھا۔ ان کے زندگی گذارنے کے انداز اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور ان کے خانوادہ کے دیگر چھوٹے بڑے ’’ثقہ افراد‘‘ سے مختلف تھے۔ ان کا ’’حلقۂ احباب‘‘ بھی خاندان کے دیگر افراد، حتیٰ کہ اپنے ہی تینوں بھائیوں سے جداگانہ تھا۔ انہوں نے اگرچہ اپنی ابتدائی عمر میں اپنے بڑے بھائی مولانا عتیق الرحمٰن کی طرح بلکہ ان کے ساتھ ساتھ عربی مدارس میں

داخلہ لے کر دینی تعلیم حاصل کی تھی ——— لیکن انہوں نے اپنی ہیئت اور وضع قطع سے لے کر اپنی تحریروں وتقریروں تک، کہیں اس کی جھلک نہیں آنے دی کہ ''اس میدان'' سے بھی ان کو کوئی رشتہ ہے؟

ان کی شناخت ایک مذہبی اسکالر کے بجائے ایک صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ہوئی ——— جب کہ میری اپنی ذاتی معلومات کے مطابق ان کی جو کچھ تعلیم (ایک رسمی طالب علم بن کر) ہوئی وہ دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں ہوئی۔ اس طرح انہیں فطری طور پر ''مولانا'' اور مولاناؤں کا ہم نشین ہونا چاہئے تھا؟۔ لیکن ان کے بے تکلف احباب، اور ''حلقۂ یاراں'' میں شاید ہی کوئی خاندان یا خاندان کے باہر کا ''مستند ومعتبر عالم دین'' رہا ہو؟۔

ان سب کے باوجود حفیظ بھائی کی شخصیت کا یہ کمال یا پھر ''تضاد'' تھا کہ ان کا اپنے مذہب ومسلک، دینی اداروں ودینی شخصیات، اپنے والد ماجد اوران کے حلقۂ اثر ونفوذ، اور اپنے خاندان و خاندان کی مقتدر شخصیات کے ساتھ مضبوط رشتہ بنا رہا۔ وہ نہ کسی کے لئے ''اجنبی'' رہے، نہ ہی انہوں نے رشتوں کے آداب واحترام کے سلسلہ میں کوئی فروگذاشت کی۔ ''ان کی دنیا'' الگ ضرور تھی۔ لیکن اس کے اندر ''احساس برتری'' کا کوئی عنصر نہیں تھا ——— بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موقع بہ موقع وہ اس کا اظہار بھی کردیا کرتے تھے کہ ''اصل دنیا'' تو ان کے والد ماجد اوران کے اسلاف صالحین ہی والی ہے۔ اوراس سے دوری ومجبوری پر وہ ''کف افسوس'' بھی مل لیا کرتے تھے؟۔

راقم الحروف کو اپنے خاندانی حوالوں سے بھی اس کا علم ہوا، اور حفیظ بھائی مرحوم نے بھی بہت تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ان کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے بریلی سے لکھنؤ کی طرف ہجرت میرے جد بزرگوار امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ کی تحریک پر اوران ہی کے زیر اثر کی تھی، اور لکھنؤ میں ان کا پہلا پڑاؤ امام اہل سنتؒ کے ادارہ ''دارالمبلغین'' ہی میں ہوا تھا۔

پھر لکھنؤ میں رہتے سہتے ان کے روابط ورشتے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، تبلیغی جماعت اوراس کے مرکز واکابر سے قائم ہوئے ——— اس طرح ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ حفیظ بھائی (جو خود ان کے اپنے بیان کے مطابق اس وقت کم عمر بچہ تھے) اوران کے والد ماجدؒ سے لکھنؤ میں سب سے پہلا اور سب سے قدیم رشتہ (اورر وہ بھی دینی وفکری بنیادوں پر) ہمارا اور ہمارے خاندان ہی کا ہے ——— دوسرے سب بعد کے ہیں؟ یعنی

میں کون کیا ہوں، میری تحریر کہے گی
خاموش ہوا تو، مری تصویر کہے گی

مناسب ہوگا کہ اپنے اس ''دعویٰ'' کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے اس جلسہ کا ذکر کردیا جائے جو حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی وفات کے بعد ان کی تعزیت کے لئے قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر حفیظ بھائی کی خواہش ودیگر کچھ احباب کے اصرار پر میں نے حضرت مولانا مرحوم کی شخصیت اوران کی وفات سے ہونے والے خلا کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اور حضرت صدر محترم کو گواہ بناتے ہوئے اس حقیقت کو بھی بیان کیا تھا کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھنؤ کب اور کس کی تحریک پر آئے؟ اور یہاں آنے کے بعد ''مدح صحابہ مشن'' میں انہوں نے کیوں کر اپنا تعاون پیش کیا؟۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کا اگرچہ دارالمبلغین سے رسمی رشتہ ختم ہوگیا تھا، لیکن ہمارے خاندانی بزرگوں سے ان کے روابط ورشتے قائم رہے۔ پھر میرا بھی ان کی خدمت میں کبھی کبھی جانا ہوتا تھا۔ نظیر آباد لکھنؤ کے جس مکان میں مولانا کا آخر عمر میں قیام تھا، اس میں ان کے ساتھ ان کے دونوں چھوٹے بیٹے مولانا محمد حسان نعمانی، اور مولانا سجاد نعمانی بھی رہتے تھے۔ جب کہ حفیظ بھائی اپنے بچوں کے ساتھ گونگے نواب پارک سے متصل اس مکان میں رہتے تھے جس کے نیچے کی منزل میں ان کا ''تنویر پریس'' اوراس کا

دفتر تھا۔ سب سے بڑے بھائی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اپنی علالت کی وجہ سے معالجین کی تجویز پر لندن میں مقیم ہوگئے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے ساتھ رہنے والے ان کے دونوں بیٹے ماشاء اللہ عالم بھی تھے، کم وبیش ہم عمر بھی۔ اور بھائی حسان سے تو ایک خصوصی رشتہ یہ بھی تھا کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی کالج میں داخلہ لے کر بی-اے کیا تھا۔ اور وہ میرے کلاس فیلو یعنی رفیق درس بھی تھے —— پھر اکثر حاضری کے موقع پر ان دونوں سے یا کسی ایک سے ملاقات بھی ہوجایا کرتی تھی۔ جب کہ اس وقت تک حفیظ بھائی سے بس کبھی کبھار ملاقات ہونے پر سلام ودعا ہوجاتی —— لیکن اسے احساس کی فرماروائی کہئے یا نگاہوں کے طلسم سے تعبیر کیجئے کہ چلتے پھرتے کی اس کبھی کبھار کی سرسری ملاقات کے وقت بھی حفیظ بھائی کے چہرہ کی شادابی اور لبوں کی مسکراہٹ ''بہت قریبی'' ہونے کا احساس دلا جاتی تھی؟ پھر وہ وقت آیا کہ میرا رسالہ ''البدر'' حفیظ بھائی کے ''تنویر پریس'' میں چھپنے لگا، اور اس بہانے حفیظ بھائی سے ملنے ملانے اور ان کی معلوماتی و پرلطف باتوں سے محظوظ ہونے کے مواقع ملنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب حفیظ بھائی پوری طرح صحت مند، ہشاش بشاش اور یوں کہنا چاہئے کہ ''ورکنگ آرڈر'' (Working Order) میں تھے۔ اگرچہ پریس کا کام کاج سنبھالنے کے لئے ان کے بیٹے شمعون نعمانی کافی تھے۔ لیکن اپنی دلچسپی یا ''اپنی محفل گرم کرنے'' کے لئے حفیظ بھائی پابندی کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ میری اور مجھ جیسے کئی لوگوں کی دلچسپی بھی پریس سے زیادہ حفیظ بھائی کی ذات میں تھی۔ اسی لئے میں اکثر مہینے میں کئی کئی بار جاتا اور کافی کافی دیر تک حفیظ بھائی کی سچی، خاندانی، علمی، ادبی، اور سیاسی موضوعات پر ہونے والی گفتگو اور انداز گفتگو سے شادکام ومحظوظ ہوتا —— حفیظ بھائی کی مجلس کی خاص بات یہ تھی کہ گفتگو چاہے کسی بھی موضوع پر، اور کتنی ہی طویل ہو —— کسی کو اکتاہٹ یا ملال نہیں ہوتا تھا۔ اور جب مجلس برخاست ہوتی تو سب اسی طرح ''تازہ دم'' اٹھتے تھے جیسے آغاز کے وقت ''تازہ دم'' بیٹھتے تھے؟؟

حفیظ بھائی جس مجلس میں ہوتے اپنی شگفتہ روئی اور اپنی شستہ وپُر بہار گفتگو کے ذریعہ جان محفل بنے رہتے۔ وہ اپنے چھوٹوں کی رعایت بھی کرتے، اور ان کی تربیت کا بھی بے حد لحاظ رکھتے —— یہی وجہ ہے کہ جس طرح وہ خود اپنے تمام بھائیوں میں اپنی نرالی شان کے ساتھ منفرد رہے اسی طرح ان کے صاحبزادگان بھی اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر ہیں۔

آخر میں حفیظ بھائی کی تعلیم وتربیت اور دوسروں کی رعایت کی مثالی ومؤثر جلوہ گری کے نمونہ کے طور پر اس واقعہ کو پیش کرنا مناسب ہے کہ حفیظ بھائی کی وفات کے ۲-۳/دن بعد ایک شام ان کے چھوٹے بیٹے ہارون نعمانی کا فون آیا اور انہوں نے اپنی اور اپنے سب سے بڑے بھائی شمعون نعمانی کی مجھ سے ملاقات کی خواہش کرتے ہوئے اسی وقت آنے کی اجازت طلب کی؟ اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد دونوں بھائی میرے گھر آگئے۔ اور آنے کا مقصد شمعون نعمانی نے جو بیان کیا وہ یہ کہ ہم لوگ آپ کے پاس اپنے ابو صاحب کی تعزیت کرنے آئے ہیں؟ میں نے سٹپٹا کر اپنی گھٹنوں کے درد کی معذوری اور علالت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''مجھے پھر تم لوگوں کے پاس آنا چاہئے تھا —— یہ تم لوگوں کی سعادت مندی ہے کہ تم خود چل کر میرے پاس تعزیت کے لئے آئے۔ جواب میں انہوں نے کہا نہیں، حقیقتاً ابو صاحب کی وفات پر تعزیت کے حق دار تو آپ لوگ ہی ہیں جو ان کے ہم نشین وقدردان رہے۔ اسی لئے ہم لوگوں نے اپنی واقفیت کے مطابق ان کے تمام احباب کے گھر جا کر ان سے تعزیت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے ان دونوں بھائیوں کو اور ان کے واسطہ سے ان کے تمام افراد خانہ کو تعزیتی کلمات پیش کرتے ہوئے یہ اعتراف کرنا بھی ضروری سمجھا کہ —— بس یہی تھیں حفیظ بھائی مرحوم کی ''امتیازی ادائیں'' اور یقیناً یہ ان ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ''تم لوگ خوشی خوشی الٹی گنگا بہا رہے ہو'' —— ورنہ ایسے مواقع پر تو لوگ اس پر نگاہ رکھتے ہیں کہ ان کے گھر کون تعزیت کے لئے آیا اور کون نہیں؟ —— حق تعالیٰ اپنے خصوصی فضل سے مرحوم کی مغفرت کاملہ فرمائے۔ (آمین)

خواجہ یونس
مٹے بھی تو اک داستاں ہو گئے ہم

۴؍مارچ ۲۰۱۹ء کو اپنے شہر لکھنؤ کی ایک منفرد اور فعال شخصیت ڈاکٹر خواجہ محمد یونس صاحب بانی منیجر ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کی اچانک ہماری اس فانی دنیا سے رحلت کی الم ناک خبر ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

یوں تو خواجہ صاحب مرحوم ایک لمبے عرصہ سے مسلسل ضعف واضمحلال اور مختلف قسم کی بیماریوں کے شکار تھے، لیکن وہ اپنی ہمت وارادہ سے اپنے کو ''باکار'' بنائے ہوئے تھے۔ صاحبزادگان کے بیان کے مطابق ۳؍مارچ کے دن اور پھر آنے والی شب تک بھی نقاہت وکمزوری کے سوا کوئی ایسی علامت نہ تھی کہ افراد خانہ کو بھی اتنی جلدی ان کی جدائی کا خیال ہوتا، لیکن مشیت ایزدی کے مطابق ۴؍مارچ کی صبح ہوتے ہوتے رات میں قریباً ۳؍بجے انہوں نے اس دنیائے فانی میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی —— اور اس طرح عزم وہمت اور جدوجہد سے بھرپور ایک زندگی کا آخری باب لکھ دیا گیا، اور یہ حقیقت ہم غافلوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر نکھر کر آ گئی کہ ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

راقم الحروف کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ خواجہ یونس مرحوم سراپا خیر تھے، اور ان سے کسی کو کبھی کوئی شکایت نہ رہی ہو، لیکن وہ اب ہم بندوں کے شکوہ وشکایت اور تعریف وتنقید کی دنیا سے آزاد ہو کر اپنے اس مالک حقیقی کے حضور پہنچ چکے جس کا معاملہ یہ ہے کہ ؎

رحمت حق بہا، نہ جوید
رحمت حق بہانہ جوید

خواجہ صاحب مرحوم سے راقم الحروف کے شعوری تعلق ورشتہ کی مدت بھی کم وبیش نصف صدی کی ہوگی اور راقم الحروف ان کی داستان زندگی کو سمیٹ کر بس اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ اس نے مرحوم کو ''زیرو سے ہیرو'' بنتے دیکھا ہے۔ ان کی تمام تر صلاحیتوں اور پایابیوں کا سرعنوان ''عزم وحوصلہ'' کو قرار دینا مناسب ہوگا۔ راقم الحروف سے ان کی شناسائی اس وقت ہوئی جب وہ انجمن تعلیمات دین ضلع لکھنؤ میں قلیل مشاہرہ کے ساتھ آرگنائزر کے منصب پر ملازم تھے اور لکھنؤ شہر سے ملیح آباد تک لگ بھگ ۲۵؍کلومیٹر کا سفر سائیکل سے کیا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ نہایت ہی بے سروسامانی کے عالم میں انہوں نے ''ارم ایجوکیشنل سوسائٹی'' قائم کی اور اس کے ماتحت ''ارم گرلس اسکول'' لکھنؤ کے محلّہ بارودخانہ کے اپنے رہائشی مکان ہی کے ایک حصہ میں قائم کیا۔ ان کے عزم وحوصلہ کو یقینی طور پر بارگاہ خداوندی سے شرف قبول ملا۔ اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا ادارہ لکھنؤ اور اپنے وطنی ضلع بارہ بنکی میں وہ اس طرح قائم کرتے گئے کہ ہر ادارہ کی اپنی نجی بلڈنگ بھی بنتی گئی —— اور اب جب کہ وہ ہماری فانی دنیا سے رخصت ہوئے تو کم وبیش پچاس تعلیمی ادارے چھوڑ کر گئے جس میں دینی مدارس کے ساتھ ہی ڈگری کالج، بی ایڈ و بی ٹی سی کے ادارے نیز بی یو ایم ایس کا منظور شدہ وترقی یافتہ کالج اور اب ایم بی بی ایس کی تعلیم کے لئے قائم کیا جانے والا کالج بھی شامل ہے اور ان تعلیمی اداروں میں بلاشبہ ہزاروں

لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور سیکڑوں گھرانوں کی روزی روٹی ان اداروں سے وابستہ ہے۔ دیگر تمام باتوں سے قطع نظر خالص انسانی نقطۂ نظر سے خواجہ صاحب مرحوم کی فروغ علم اور افراد سازی کی اس کاوش سے کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے؟۔

ہمارے علم میں یہ بات ہے کہ خواجہ صاحب کا کام کرنے کا اپنا انداز تھا۔ اور اس ''انداز کار'' سے بہت سے لوگوں کو شکایات بھی رہیں؟ مجھے نہ اس کا حق ہے کہ میں ان شکایات کا تجزیہ کروں، نہ ہی اب جب کہ خواجہ صاحب ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے، ایسے کسی تجزیہ کا کوئی حاصل و نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ —— البتہ قابل غور بات یہ ہے کہ وہ جو درجنوں کی تعداد میں تعلیمی ادارے چھوڑ کر اس دنیا سے گئے ہیں، ان کا نفع عام لوگوں تک بھی پہنچے گا یا نہیں؟ صرف پیسہ کمانا ہی اگر ان کا مطمح نظر ہوتا تو وہ ایک کے بعد ایک تعلیمی ادارے قائم کرنے کے بجائے کوئی ایک ''فیکٹری یا کارخانہ قائم کر کے اپنی اور اپنی نسلوں کے لئے مال و دولت اکٹھا کرنے کا انتظام کر سکتے تھے؟ مجھے اس سے انکار نہیں کہ انہوں نے مختلف نوعیت کے تعلیمی ادارے قائم کئے، اور آج کے مروجہ چلن کے اعتبار سے ان میں سے کئی اداروں سے انہوں نے مالی منافع بھی حاصل کئے —— لیکن کوئی تو وجہ ہوگی کہ انہوں نے بس فروغ علم کے ادارے ہی قائم کرنے پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھا؟

کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے کہ میں خواجہ صاحب کا ''وکیل صفائی'' بن کر ان کی بے جا تعریفوں کے دفتر کھولنا چاہتا ہوں؟ بفضلہٖ تعالیٰ خواجہ صاحب سے میرے بہت خوشگوار تعلقات رہے، لیکن ''بے غرضانہ'' ہی رہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی بعض ادائیں ایسی تھیں جو نہ صرف پر کشش بلکہ لائق تقلید تھیں —— مثلاً یہ کہ مال و دولت کی فراوانی، اور ہر قسم کے سامان آسائش و آرائش مہیا ہونے کے باوجود انہوں نے نہ اپنی ابتدائی زندگی کے غربت و افلاس کو

فراموش کیا نہ ہی اس دور کے احباب و اقرباء کو۔ ''نو دولتیوں'' میں عموماً جو تمکنت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ ''اپنے ماضی'' سے پیچھا چھڑانے کے لئے ماضی کے آثار ہی نہیں، ماضی کے احباب و ''حلقۂ احباب'' سے فاصلہ بنا لینا ضروری سمجھنے لگتے ہیں —— اس کا خواجہ صاحب کے یہاں دور دور تک گذر نہیں تھا۔ وہ جس سے ملتے کھل کر اور ٹوٹ کر ملتے اور کسی کو یہ الزام لگانے کا موقع نہیں دیتے کہ ''خواجہ صاحب بدل گئے ہیں''؟۔

ان کی ایک قابل ذکر ادا یہ بھی تھی کہ وہ ''اپنے مفادات'' کے تحفظ اور ان کے حصول کے لئے تو بہت چاق و چوبند رہتے، لیکن اس سلسلہ میں ان کی سوچ مثبت تھی، یعنی وہ اپنے مفاد پر تو نگاہ رکھتے لیکن کسی کو نقصان پہنچانے یا کسی دوسرے کے مفادات کے حصول کی راہ میں حارج بننے کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انہیں بس ''اپنے کام سے کام رہتا'' دوسروں کی راہ کا روڑہ نہیں بنتے تھے۔ ذاتی اور نجی زندگی کے سلسلہ میں میرا اپنا مشاہدہ و تجربہ یہ رہا کہ وہ اپنی عزت کروانے سے زیادہ دوسروں کی عزت کرنے کو پسند کرتے تھے اور اس کے لئے ''تقریب بہر ملاقات'' کو بھی انہوں نے اپنے معمولات میں شامل کر رکھا تھا۔ ضلع بارہ بنکی کے ایک دیہات سے اٹھ کر اور ابتدائی تعلیم مدارس میں حاصل کر کے انہوں نے لکھنؤ شہر میں آ کر اپنی ایک شناخت بنائی۔ علمی، ادبی، اور دینی حلقوں میں رسائی حاصل کی۔ برائے نام اور ''برائے کار'' سیاست میں بھی پینگیں بڑھائیں۔ لیکن ذوق سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی حلقہ میں ان کی کوئی شناخت نہیں قائم ہو سکی۔

وہ مسلمان تھے، اس لئے حج اور عمرے بھی کئے، بہت شاندار مسجد بھی تعمیر کرائی، اور دینی تعلیم کے لئے کچھ ادارے بھی قائم کئے۔ ہماری ظاہری نگاہوں نے یہ سب کچھ دیکھا —— باقی رہا نیت و اخلاص کا معاملہ، تو وہ اللہ اور اس کے مسلمان بندہ کے درمیان کی چیز ہے۔ جس میں کسی کو دخل دینے کا حق حاصل

نہیں ہے ـــــــ البتہ اس سلسلہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جس سے ان کی علم دوستی اور فکر آخرت دونوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے؟

انتقال سے کم وبیش ۱۰-۸ ربرس قبل خواجہ صاحب زبردست قلبی حملہ کے شکار ہوکر لکھنؤ کے سول اسپتال میں داخل ہوئے۔ بہت شدید حملہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی جان بچائی۔ طبیعت میں کچھ افاقہ ہونے کے بعد ایک روز میں عیادت کے لئے گیا، ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق ملنے ملاقات کرنے میں احتیاط برتی جا رہی تھی۔ مگر مجھے آسانی کے ساتھ ان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ مجھے دیکھ کر ان کے آنسو بھر آئے۔ بیماری سے بہت متاثر اور فطری طور پر موت سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے دلاسہ تسلّی دیتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھانے کے ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کے سلسلہ میں بھی مختصر بات کی۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر بہت ہی درد بھرے انداز میں کہا، مولانا! موت سے تو چھٹکارا کسی کو نہیں مل سکتا ہے وہ تو آ کر رہے گی۔ مگر دعا کردو کہ اللہ میاں اس وقت صحت دے دیں۔ بہت سے اسکول کالج وغیرہ قائم کر لئے، لڑکیوں کا ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا پورا پروگرام بن گیا ہے، اللہ میاں اتنی مہلت دے دیں کہ ہم یہ کام صرف دین کے لئے کرلیں ـــــــ اس کے بعد مرنا تو ہے ہی!

مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے دعا کرنے کی بات کچھ اس درد وسوز کے ساتھ کہی تھی کہ ان کے ساتھ ہی میری اور قریب ہی کرسی پر بیٹھی ان کی اہلیہ مرحومہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

خواجہ صاحب کی اس آرزو کو اللہ تعالیٰ نے پورا کیا، ان کو صحت بھی ہوئی اور انہوں نے پورے آن بان کے ساتھ لکھنؤ کے محلّہ اکبر نگر میں لڑکیوں کا اپنا یہ مجوزہ اقامتی مدرسہ بھی قائم کرلیا۔

جن حالات میں جس انداز سے انہوں نے اس مدرسہ کے قیام کو اجر آخرت کی امید پر قائم کرنے کی بات کہی تھی اسے میں تو خیر ہی قرار دینے پر

مجبور ہوں؟۔

خواجہ یونس ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہوکر اپنے اس رب کریم کے حضور پہنچ گئے جس کی رحمت و پردہ پوشی کے بغیر کسی کا بیڑا پار نہیں لگ سکے گا۔ اور جس کا رحم و کرم اپنے شایان شان ہوگا۔ ہم گنہگار و خطا کار بندے تو اس اعتراف کے ساتھ اسی کی رحمت کے امیدوار ہیں کہ

مری زندگی، تری بندگی، مرا شیوہ عجز و نیاز ہے
میں گدائے عاجز و بے نوا، تو کریم و بندہ نواز ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنے چاروں بیٹوں کو مختلف اداروں کی ذمہ داریاں سونپ کر اور اپنی نگرانی میں ان کو اداروں کے انتظام و انصرام سے وابستہ کر کے اس لائق بنا دیا تھا کہ وہ مرحوم کے تعلیمی مشن کو فروغ دینے کے اہل ہو چکے ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ وہ اپنے والد مرحوم کے تعلیمی مشن کو اور آگے بڑھائیں گے۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز

○○○○○ ━━━ ❀ ━━━ ○○○○○

عبدالمنان قاسمی
وہ ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جائے گا

۱۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ کے آغاز کے بعد اور ۱۲؍جنوری ۲۰۲۰ء کے آغاز سے چند منٹ قبل یعنی ۱۱؍جنوری ۲۰۲۰ء کو رات قریب ساڑھے گیارہ بجے کئی ماہ کی شدید تکالیف اور علالت کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد رو انٹا ہسپتال میں میرے سب سے بڑے اور سعید وصالح بھانجے مولانا عبدالمنان قاسمی استاذ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اس کے دوسرے ہی دن ۱۳؍جنوری ۲۰۲۰ء کو صبح نو بجے کے قریب میری حقیقی پھوپھی زاد بہن کے بنارس میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر جانے کی اطلاع برادرم حافظ عبدالسمیع سلّمہٗ نے دے کر غم فراق کو دوبالا کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دونوں عزیزوں کی اس مشترکہ محرومی اور ان شاء اللہ آخرت میں انعام و اکرام کے سبب کا سب سے پہلے ذکر کرنا ضروری ہے کہ حق تعالیٰ نے دونوں کو اس دنیا میں اولاد کی نعمت سے سرفراز نہیں کیا جس کی کسک لے کر وہ اس دنیائے فانی سے گئے ولدارالآخرۃ خیر وابقیٰ۔

عبدالمنان قاسمی (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منھ کو آرہا ہے اور جنہیں ہم سب اہل خانہ ان کے ظاہری حسن وجمال سے زیادہ اپنی چاہتیں ومحبتیں

نچھاور کرنے کے لئے ''چاند'' کہہ کر پکارتے تھے) میری سب سے بڑی بہن کے پہلے بیٹے اور میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ کی دوسری پیڑھی کے پہلے فرد تھے، اس لئے نانا نانی سے لے کر ہم تمام خردوں تک سب ہی کی آنکھوں کا تارا بن کر پلے بڑھے۔ حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے ذہانت وسعادت کی نعمتیں عطا کی تھیں اس لے بہت کم عمری میں حفظ قرآن مجید اور اس کے بعد تکمیل تجوید بروایت حفصؒ کی سعادتیں حاصل کرلیں۔ پھر اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق جماعت فارسی سے مشکوٰۃ شریف وغیرہ کی جماعت تک پوری تعلیم دارالعلوم فاروقیہ کاکوری میں حاصل کرنے کے بعد ام المدارس دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۷۸ء میں امتیازی نمبرات کے ساتھ سند فضیلت حاصل کی۔ اس دوران اور اس کے بعد الٰہ آباد عربی و فارسی بورڈ کی مولوی، منشی سے لے کر فاضل تک کی تمام سندیں بھی اعلیٰ نمبرات کے ساتھ حاصل کیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے نانا کے ایماء سے ان کے قائم فرمودہ مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ سے بہ حیثیت مدرس عربی وابستہ ہوگئے جس کا سلسلہ زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا۔ وہ اپنے اساتذہ کے انتہائی مطیع وفرماں بردار اور اپنے طلبہ پر انتہائی شفیق ومہربان رہے۔ دارالعلوم فاروقیہ کے دور طالب علمی میں بہت اچھی تقریریں کرتے تھے جس سے یہ توقع تھی کہ اپنے نانا کی طرح وہ بھی اپنے وقت کے ایک کامیاب خطیب بنیں گے، لیکن دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد واپس آئے تو ذوق خطابت بالکل ختم ہو چکا تھا، البتہ لکھنے پڑھنے کے ذوق کی وجہ سے متعدد مضامین دیگر رسائل واخبارات کے ساتھ ہی ''البدر'' میں بھی شائع ہوئے جو جون ۱۹۷۷ء سے شائع ہونا شروع ہو چکا تھا اور دیوبند سے واپسی کے بعد ان کا نام بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل کرلیا گیا تھا۔

مزاج میں شروع ہی سے ایک وارفتگی تھی، ان کا حلقۂ احباب مختصر لیکن

"ان کا اپنا" رہا جس میں علماء، قراء، اور شعراء وادباء سب ہی شامل تھے لیکن بڑی تعداد شعراء کی تھی اور ملک گیر ہی نہیں عالم گیر شہرت کے حامل شعراء سے ان کے بہت ہی بے تکلفانہ مراسم تھے۔ اللہ جانے ان کی ذات وبات میں کیا ایسی کشش تھی کہ وسیم بریلوی، شمیم جے پوری، خمار بارہ بنکوی، راحت اندوری، کشفی لکھنوی، بشیر فاروقی، ساغر اعظمی اور اثر بہرائچی جیسے نامی گرامی شعراء کرام نہ صرف ان کا بے حد لحاظ کرتے تھے بلکہ ان کی ضد اور فرمائش پوری کرنے کے لئے اپنا کلام بھی "البدر" میں اشاعت کے لئے دیتے تھے جسے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی خصوصی نگرانی میں شائع کراتے تھے۔ اپنی الگ ڈگر بنانے کا یہ مزاج ایسا تھا کہ مدرسہ میں بھی اپنے ہم رتبہ وہم عصروں، اپنے اساتذہ کرام و دیگر درجات عربی وفارسی کے اساتذہ سے زیادہ اٹھنا بیٹھنا درجات حفظ وتجوید کے اساتذہ خصوصاً حافظ محمد ہاشم مرحوم اور قاری محمد فضل الرحمٰن صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے بعد ان کی ترجیح میں مدرسہ کے طلبہ ہوتے، ان سے کھل مل کر باتیں کرتے، اپنے لئے چائے منگواتے تو اکثر دو چار طالب علموں کے لئے چائے ضرور منگوا کر انہیں پلاتے بلکہ بسا اوقات تو طلبہ ان سے فرمائشیں کرتے جنہیں وہ خوش دلی کے ساتھ پوری کرتے۔ مدرسہ کے درجہ چہارم کے ملازم علی حسن مرحوم سے تو ایسی بے تکلفی تھی اور ان سے بسا اوقات ایسی چھینا جھپٹی کرتے کہ کئی مرتبہ مجھے ٹوکنا بھی پڑا۔ خاموشی کے ساتھ دوسروں کا تعاون کرتے، طلبہ واساتذہ خصوصاً درجات پرائمری کے اساتذہ اور کم رتبہ ملازمین کو بوقت ضرورت بڑی بڑی رقمیں قرض دے دیتے، اور پھر ان کی واپسی کا کبھی تقاضا نہیں کرتے، متعدد مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ طالب علم ان کی رقم لے کر مدرسہ سے چلے گئے اور ان کی رقمیں ڈوب گئیں مگر انہوں نے نہ اس کا کسی سے شکوہ کیا نہ ہی اپنی روش میں کوئی تبدیلی کی بلکہ اگر کوئی طالب علم کبھی پلٹ کر برسوں کے بعد ملنے ملانے کے لئے مدرسہ آیا تو ملاقات کے باوجود اپنی پچھلی رقم کا اس سے

کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ آنے والے نے ازخود اصرار کر کے اور یاددہانی کر کے اپنے قرض کی رقم واپس کرنا چاہی تو بہت ہی ردوکد اور اصرار کے بعد ہی انہوں نے اسے قبول کیا ورنہ بس یہی ایک بات کہ جاؤ جاؤ بس جو ہونا تھا ہو گیا، میں نے معاف کیا۔

مزاج میں سادگی اور عاجزی وفروتنی ایسی کہ مدرسہ اور مدرسہ کے باہر ہونے والے کسی بھی پروگرام میں انہیں اسٹیج پر بیٹھے دیکھنا مجھے یاد نہیں ہے۔ مشاعروں میں شرکت کے بہت شوقین تھے اور بسا اوقات نامی گرامی شعرائے کرام انہیں اپنے ساتھ اسٹیج پر لے جانے کا اصرار کرتے، مگر اسے کبھی منظور نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید کے بہت ہی عمدہ حافظ تھے، چلتے پھرتے کثرت کے ساتھ تلاوت قرآن کرتے رہتے۔ مدرسہ میں تقسیم اسباق کے وقت ترجمہ وتفسیر قرآن کا کوئی نہ کوئی سبق مطالبہ کر کے لیتے اور پھر کافی محنت ومطالعہ کے بعد سبق پڑھاتے۔ دارالعلوم دیوبند کے اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ سے خصوصی عقیدت ومحبت تھی، ان کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ بار بار کرتے تھے اور ان کی شان میں ہونے والی کسی ادنیٰ بے احترامی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ دارالعلوم فاروقیہ میں تدریس کے ابتدائی دور میں ایک مرتبہ شاہ صاحب مرحوم کی نقل میں ایک لیٹر پیڈ چھپوایا تھا جس میں اپنے کو "شیخ التفسیر" لکھوایا تھا۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں دماغی امراض اور دوروں کی شکایت ہونے سے معذوری بڑھتی گئی۔ پہلی سے چہل پہل اور سرگرمیاں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں۔ کوئی موقع ہاتھ آتے ہی اپنی بارہ بنکی والی خالہ (جنہیں وہ اکثر اپنی اماں کہتے تھے) کے پاس جانا بھی کم سے کم تر ہو گیا۔ اکثر خاموش رہتے اور بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ خصوصی رفقائے درس میں مولانا محمد شفیع قاسمی صدر مدرس دارالعلوم فاروقیہ، مولانا محمد اکرم قاسمی منڈولی، مولانا محمد عرفان قاسمی سیتاپوری، مولانا محمود دریابادی (آخر الذکر دونوں حضرات ممبئی

میں ہیں) اوران کے علاوہ احباب میں قاری عتیق الرحمٰن صاحب سابق استاذ مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ و مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، فرحت حسین جعفری صاحب تاجر عطر لکھنؤ، قاری صبغت اللہ صاحب صدر شعبۂ تجوید مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ تھے۔ جن سے کبھی بہت گہرا اور بے تکلفانہ ربط و رشتہ تھا، لیکن جوں جوں معذوری بڑھتی گئی ان حضرات سے بھی ملنے کا پہلا سا انداز باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اگست ۲۰۱۹ء کے اواخر میں برین ہیمبرج کا زبردست اٹیک ہوا، پہلے فہمینہ ہسپتال، پھر چرک ہاسپٹل اور لوہیا ہسپتال کے بعد آخر میں روانٹا ہسپتال میں داخل کئے گئے۔ قلیل وقفہ کے لئے کچھ سدھار ہوا، ہوش میں آئے اور بات چیت بھی کرتے رہے، لیکن معمول کے مطابق نہ منھ سے غذا ہوسکی نہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکے جس کی وجہ سے کمزوری، لاغری کی حد تک بڑھ گئی تھی ـــــ بالآخر ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۱/ جنوری ۲۰۲۰ء کو رات قریباً ساڑھے گیارہ بجے وقت موعود آ گیا اور وہ ہماری اس فانی دنیا سے اپنی بیوہ ماں اور بہت سے بڑوں کی موجودگی میں اپنے رب کریم کے حضور کوچ کر گئے۔

فیاایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

رب کریم نے اپنی امانت واپس لے لی اس میں کسی کو نہ واویلا کا حق ہے نہ ہی شکوہ شکایت کا ـــــ اطمینان کی بات یہ ہے کہ مرحوم سبک بار جیئے اور سبک بار ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسباب کے درجہ میں دوا علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہیں رہی۔

حق تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ چین عطا فرما کر اپنے قرب خاص سے نوازے۔ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ ان کی ان ضعیف العمر اور بیوہ ماں کو جنہیں دوسری مرتبہ ایسے حادثہ سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ان بیوہ ہو جانے والی زوجہ کو جس کے پاس ان کی یادوں سے

دامن چھڑانے کے لئے اپنی کوکھ کی کسی اولاد کا بھی سہارا نہیں ہے، اور پھر جملہ پسماندگان اور بھرے پرے کنبہ کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ (آمین)

دل میں یادِ غم بے کراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

◎◎◎◎◎ ▬▬ ❁ ▬▬ ◎◎◎◎◎

حسین امین
سنجیدہ صحافی، عظیم انسان

بعض لوگ بہت خاص ہوتے ہوئے بھی اپنی اختیاری سادگی اور عاجزی وفروتنی کے ذریعے اپنے کو عام رکھ کر ہی مگن رہتے ہیں۔ وہ ''چہیتے'' ہوتے ہیں، لیکن انہیں چاہنے والے بھی نہ کھل کر اس کا اظہار کر پاتے ہیں، نہ ہی ''چہیتے'' کو اپنے کو کسی کے لئے خاص یا چہیتے ہونے کا احساس ہو پاتا ہے — بات ایک وضعدار، منکسر المزاج، اور تبسم برلب صحافی حسین امین صاحب مرحوم کی ہے، جن کے دل سے اتنا قریب ہونے کا احساس خود راقم الحروف کو بھی ان کے اس دنیائے فانی سے کوچ کر جانے کے بعد ہی صحیح طور پر ہوسکا؟

حسین امین صاحب نے جب ہماری اس فانی دنیا سے عالم باقی کی طرف کوچ کیا، تو ان کا شمار اردو کی صف اول کے صحافیوں میں ہوتا تھا۔ یوں تو صحافت انہیں وراثت میں ملی تھی کہ ان کے والد ماجد امین سلونوی صاحب مرحوم نہ صرف ایک پختہ کار صحافی وقلم کار تھے، بلکہ انہوں نے اختراعی طور پر اپنے محدود وسائل کے ساتھ اردو کی ایک نیوز ایجنسی بہ نام ''انڈی پنڈنٹ نیوز سروس'' بھی قائم کی تھی، اور اس کے مخفف نام ''الف، نون، س'' سے وہ مختلف اخباری مواد روزنامہ ''قومی آواز'' لکھنؤ و دیگر اخبارات کو دیا کرتے تھے۔ اردو کے معروف و صاحب طرز مزاح نگار شوکت تھانوی (جو امین سلونوی صاحب کے حلقۂ احباب

میں شامل تھے) کے بہ قول امین صاحب نے اپنی صحافت کے ''عنفوان شباب'' میں ایک رسالہ ''ترچھی نظر'' کے نام سے بھی نکالنا شروع کیا تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں نسیم انہونوی اور عمر انصاری جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

حسین امین مرحوم نے اسی ''صحافت کی کہکشاں'' میں شعور کی آنکھ کھولی تو انہیں فطری طور پر صحافی تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ وہ اپنے والد کی وراثت یا وساطت سے ''قومی آواز'' جیسے اردو اخبار سے وابستہ ہوئے تو وہاں کے ماحول اور تربیت نے انہیں بتدریج صف اول کا صحافی بنا دیا۔ کیوں کہ اردو دنیا کی صحافت میں یہ بات مسلّم ہے کہ ''قومی آواز'' اردو کا ایک اخبار ہی نہیں، بلکہ اردو صحافت کا ایک ایسا ٹریننگ اسکول تھا کہ اس سے کچھ عرصہ تک وابستہ رہ جانے والا بھی ایک ''منفرد و معتبر صحافی'' بن جایا کرتا تھا، جب کہ حسین امین صاحب کی تو ''قومی آواز'' سے وابستگی اخبار کی آخری سانس تک رہی؟

حسین امین صاحب مرحوم سے با قاعدہ تعارف کے ساتھ ملنے ملانے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب نہ صرف وہ بھرپور جوان تھے بلکہ ان کا اخبار ''قومی آواز'' بھی ''جوان رعنا'' تھا۔ اس کے بانی مدیر حیات اللہ انصاری پوری طرح کار بند تھے، اور ان کے معاونین میں عشرت علی صدیقی، مسیح الحسن رضوی، عبدالمجیب سہالوی، احمد جمال پاشا، اور چودھری نصیر وغیرہ جیسے منجھے ہوئے اور پختہ کار صحافی تھے۔ ان حضرات کے مقابلہ میں حسین امین مرحوم اس وقت بہت کم عمر، ناتجربہ کار اور جونیئر تھے۔ ان کا تعلق اخبار کے ''ڈسک ورک'' سے نہیں تھا، بلکہ وہ ایک رپورٹر تھے۔ جن کی دفتر میں ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ وہ اپنی جمع کی ہوئی خبریں لے کر دفتر جاتے تو کافی کافی دیر تک وہاں ٹھہرتے۔ اس دوران کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کوئی خبر لے کر گیا، اور میری ''خوش قسمتی'' سے حسین امین صاحب مجھے مل گئے تو ان کے ذریعہ خبر کی اشاعت یقینی ہو جایا کرتی تھی۔ ویسے اس کام میں احمد ابراہیم علوی صاحب اور شعبۂ کتابت سے وابستہ سلیم عمر صاحب مرحوم سے بھی مجھے تعاون مل جایا کرتا تھا —— بات دراصل یہ

تھی کہ اس وقت ''قومی آواز'' کا اپنا ایک ایسا بلند معیار تھا کہ اس میں خبروں کی اشاعت آسان نہیں تھی، پھر خبروں کے انتخاب اور ان کی جائے اشاعت کا بھی اپنا ایک معیار تھا؟۔ میری اپنی ہر خبر کے لئے یہ خواہش ہوتی کہ اس کی اشاعت ''مختصر مقامی خبریں'' والے ''بھرتی کے کالم'' میں نہ ہو کر مستقل سرخی کے ساتھ ہو —— اور اس وقت کے ''قومی آواز'' میں یہ التزام واہتمام آسان نہیں تھا، اور اسے آسان کرنے کا کام اکثر حسین امین انجام دے کر مجھے خوش کردیا کرتے تھے۔

حسین امین مرحوم صحافت کے اس عہد سے وابستہ تھے جب صحافت سے وابستگی ''شرافت'' سے وابستگی کی ضمانت ہوا کرتی تھی، اور عموماً شاعر کی طرح صحافی بھی سماج کا ایک معزز فرد تو ہوتا تھا لیکن ''متمول'' نہیں۔ دور حاضر کی طرح نہ صحافی کروڑوں کا بیلنس رکھتا تھا، نہ ہی اسے رہائش کے لئے شاندار بنگلہ اور سواری کے لئے لگژری کاریں میسر ہوتی تھیں —— ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کے قلم کے دھار سے ''ایوان اقتدار'' میں ہر وقت زلزلہ کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لانے والی پولیس کے ''ہاتھ کا ڈنڈا'' صحافی کو دیکھتے ہی ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہو جایا کرتا تھا۔ غالباً ایسے ہی صحافی وغیر صحافی برادری کے قلم کاروں کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پنڈت آنند نرائن ملاّ نے اپنا یہ ''متنازعہ شعر'' کہا تھا کہ ؎

خون شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

حسین امین مرحوم کی صحافتی تربیت اردو کے قدآور صحافی، بلکہ ''صحافتی اسکول'' حیات اللہ انصاری مرحوم کے زیر سایہ ہوئی تھی جسے اپنے گھر سے اپنے دفتر آتے جاتے خود راقم الحروف نے لگژری کار سے نہیں، بلکہ سائیکل رکشہ کی سواری پر دیکھا ہے —— اور یہ منظر اس وقت بھی نگاہوں کے سامنے آیا جب وہ ملک کی آزادی سے پہلے کی کانگریس پارٹی سے اٹوٹ وابستگی، اور آزاد

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر ''آئرن لیڈی'' کہلائی جانے والی وزیر اعظم اندرا گاندھی تک براہ راست ''بالحاظ رشتوں'' کے ذریعہ ملک کے ایوان بالا (راجیہ سبھا) کے باوقار رکن تھے —— حسین امین کو بھی اردو صحافت کے ''نیر تاباں'' بن جانے کے باوجود نہ کبھی ''شاندار بنگلہ'' میں رہائش نصیب ہوئی، نہ ہی سواری کے لئے لگژری کار —— اور انہوں نے اپنی حیات مستعار کی آخری سانس بھی اسی پتلی سی گلی کے بالائی منزل پر واقع اس چھوٹے سے کمرہ میں لی جہاں تک پہنچتے ہوئے ان کی سانسوں کا توازن بگڑ جایا کرتا تھا، اور بسا اوقات ''دم لینے کے لئے'' انہیں درمیان کے کسی زینہ پر ٹھہرنا پڑ جاتا تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے یہ ایسے ''کھڑے زینے'' تھے کہ جب راقم الحروف اچانک ان کی وفات کی خبر سے بے چین ہو کر ان کے آخری دیدار کے لئے اس ''پل صراط نما زینوں'' کو عبور کر رہا تھا تو میری ''قابل رحم حالت'' دیکھ کر چڑھتے اور پھر اترتے ہوئے دیکھنے والے بے ساختہ سہارا دینے پر مجبور سے ہو گئے تھے —— مگر اللہ رے حسین امین مرحوم کی شان بے نیازی، اور ''فقر پر فخر'' کے اس انداز کے ساتھ اپنے فرض کی ادائیگی میں انہماک کہ کسی نے کبھی بھی انہیں منھ بسور کر شکوہ کرتے نہیں پایا، بلکہ پوری فرحت وانبساط کے ساتھ وہ دریافت حال کرنے والوں سے مسکرا مسکرا کر اپنی اسی رہائش کا پتہ بتا کر انہیں بھی ''دعوت امتحان'' دیا کرتے تھے۔

''قومی آواز'' بند ہونے کے بعد غالباً حسین امین صاحب نے کسی اخبار سے ملازمت کا رشتہ نہیں قائم کیا۔ وہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے روزنامہ ''صحافت'' کے لئے لکھتے تھے لیکن میں اس اخبار سے ان کے تعلق کی نوعیت سے واقف نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس اصول پر کاربند تھے کہ ''گھوڑے سے اتر کر گدھے کی سواری نہیں کی جاتی''۔ ''قومی آواز'' ان کی شناخت بھی تھا اور اسی نے انہیں مکمل صحافی بھی بنایا تھا۔ ''قومی آواز'' میں انہوں نے ملک کے کئی اہم اور سلگتے ہوئے مسائل کی ایسی سنجیدہ، غیر جذباتی، اور مبنی

برصداقت وانصاف رپورٹنگ کی تھی کہ ان کی تیار کردہ خبروں کو جہاں ملک و
بیرون ملک کے متعدد بڑے اور اہم اردو اخباروں نے من وعن شائع کیا، وہیں
انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے اخبارات نے ان کی خبروں پر ''اعتماد
کرتے ہوئے ان کا ترجمہ کرواکر اپنے اخباروں کی زینت بنایا۔ شاہ بانو کے
مشہور مقدمہ اور اس پر اٹھنے والے طوفان بلاخیز سے لے کر مسلم ''مطلقہ خواتین
قانون'' بننے تک کی خبروں کی جیسی متوازن ودیانت دارانہ رپورٹنگ انہوں نے
کی، اسی طرح ''بابری مسجد'' کو لے کر اٹھنے والی ''رام جنم بھومی تحریک'' اور اس
سے وابستہ مقدمات کی مرحلہ وار اور تفصیلی رپورٹنگ کے لئے بھی حسین امین کی
منصفانہ ودیانت دارانہ صحافت کو یاد کیا جائے گا۔

حسین امین ایک بااخلاق، بامروت، اور وضع دار انسان تھے۔ وہ اپنے
تمام بڑوں خصوصاً علمائے کرام سے بہت ہی احترام اور نیازمندی کے ساتھ
ملتے، علمائے کرام بھی ان کے اخلاص و اخلاق کے بہت قدردان رہے۔
حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی وجہ سے ندوہ اور حلقۂ
ندوہ میں ان کی بہت پذیرائی تھی۔ ان ہی کی تحریک ومشورہ پر دارالعلوم ندوۃ
العلماء میں ''شعبۂ صحافت'' کا قیام عمل میں آیا، اور حسین امین صاحب اس
شعبہ کے طلبہ کو ''صحافی گر'' سکھانے کے لئے باقاعدہ پابندی کے ساتھ جاتے
اور طلبہ کو اپنے ''صحافتی تجربات'' تقسیم کرتے رہے۔

حسین امین ہماری اس فانی دنیا سے جب رخصت ہوئے تو ان کا نام
''دنیائے صحافت'' میں سند واعتبار کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ وہ اردو کے ان چند
گنے چنے صحافیوں میں سے تھے جن کے ''حلقۂ یاراں'' میں اردو ہی نہیں بلکہ
پرنٹ میڈیا سے لے کر الیکٹرانک میڈیا تک دیگر زبانوں کے متعدد قدآور اور
اہم صحافی بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات پر جہاں اردو کے صحافی
رنجیدہ ومغموم ہوئے وہیں ہندی وانگریزی کے صحافیوں نے بھی ان جیسے مخلص و
بےباک صحافی کی موت کو دنیائے صحافت کے لئے ایک خلا قرار دیا۔

حسین امین کی صحافت اور صحافتی زندگی کی سب سے اہم اور لائق تقلید
خوبی ان کی دیانت داری، بے غرضی و بے نیازی تھی۔ ان کی سادگی، وضعداری اور
بےنفسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں بہلا اور پھسلا کر یا اپنے کو ''قابل رحم''
بنا کر تو کام لیا جاسکتا تھا، لیکن انہیں خریدا نہیں جاسکتا تھا— وہ ایک انسان تھے،
ایک مسلمان تھے، اپنی مذہبی اور مسلکی ترجیحات کا پاس ولحاظ رکھنے والے تھے۔
اسی طرح ان کے اپنے سیاسی اور ملّی رجحانات بھی تھے اور ملّی تنظیموں وتحریکوں
سے ان کی باقاعدہ وابستگی بھی رہی — لیکن اصول، انصاف، اور احترام کے
دامن ان کے ہاتھوں سے کبھی نہیں چھوٹے۔ انہوں نے اپنے قلم اور صحافت
سے اپنی پسندیدہ شخصیات، جماعتوں، اور تحریکوں وتنظیموں کی مدح سرائی تو کی،
لیکن پگڑیاں اچھالنے، دل آزاری کرنے، جذبات کو مجروح کرنے، اور
اداروں، جماعتوں، تنظیموں وتحریکوں کی ''حیثیت عرفی'' کو پامال کرنے کا جرم
انہوں نے کبھی نہیں کیا، وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے موافقت بھی کرتے
اور مخالفت بھی، لیکن دونوں کو پیش کرتے ہوئے اعتدال وتوازن کو پورے لحاظ
کے ساتھ برقرار رکھتے، موافقت کے ڈانڈے خوشامد اور چاپلوسی سے ملا دینے
اور مخالفت کے ڈانڈے بغض وکینہ اور یاوہ گوئی سے ملا دینے کو وہ کبھی گوارہ نہیں
کرتے تھے — انہیں اور ان کے قلم وصحافت کو سمجھنے کے لئے ان کی کتاب
زندگی کے ان دو واقعات کو بہ طور مثال پیش کیا جاسکتا ہے:

(۱) ان کی صحافتی زندگی کی سب سے زیادہ وابستگی پنڈت
جواہر لال نہرو اور حیات اللہ انصاری کے جاری کردہ اور ان کی
''کانگریس پارٹی'' کے ترجمان اخبار ''قومی آواز'' سے رہی،
پھر وہ ذاتی طور پر بھی اپنے گھریلو ماحول کے زیر اثر سیاسی
رجحان کے لحاظ سے ''کانگریسی'' تھے —— انہوں نے ''قومی
آواز'' میں بھی، اور ''قومی آواز'' کے بعد بھی اپنے لیڈروں اور
اپنی پارٹی کی موقع بہ موقع خوب خوب مدح وتوصیف کی۔ اور یہ

کہہ دینے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ ''ان کی سیاہی'' کو دھونے
اور لیپا پوتی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی —— اسی کے
ساتھ ان کے مخالفین کا ''واجبی تعاقب'' کرنے سے بھی گریز
نہیں کیا۔ تاہم ''ذی مرتبت و باوقار مخالف لیڈروں اور ان کی
پارٹیوں کے سلسلہ میں کوئی ایسا ''مبتذل و سوقیانہ لفظ'' استعمال
نہیں کیا جس پر انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہو؟

(۲) وہ مسلمانان ہند کی سب سے قدیم و باوقار تنظیم ''جمعیۃ
علمائے ہند'' سے ذہنی و فکری اور عملی طور پر ہمیشہ وابستہ رہے۔
بدقسمتی سے چند برس پہلے اس تنظیم پر ایسا وقت آیا کہ وہ دو
دھڑوں میں تقسیم ہو گئی، اور دونوں ہی دھڑے اپنے کو اصل
''جمعیۃ علماء'' گرداننے لگے۔ مرکز سے لے کر صوبوں، اضلاع،
اور قصبات تک دونوں کی الگ الگ یونٹیں، اور دفاتر بھی قائم
ہو گئے۔

فطری طور پر اس تقسیم کا اثر اوپر سے لے کر نیچے تک تنظیم کے تمام
کارکنوں اور باقاعدہ وابستگان پر پڑا۔ اور انہیں اپنی ''جماعتی وفاداریاں'' کسی
ایک دھڑے کی طرف منتقل کرنا پڑیں۔ اس ''آپا دھاپی'' میں یہ بھی ہوا کہ کچھ
کیسے کیسے، ایسے ویسے ہوئے —— تو کچھ ایسے ویسے، کیسے کیسے ہو گئے؟۔

تقسیم کے ابتدائی دور میں وہ بھی ہو کر رہا جو کسی بڑے اور تناور درخت
کے گرنے سے زمین اور اہل زمین کے لئے ہوا کرتا ہے کہ کسی کا ''بھلا'' ہوتا
ہے تو کسی کا نقصان! حسین امین صاحب جو اپنی ذات ہی سے نہیں، موروثی طور
پر ''جمعیۃ'' سے وابستہ تھے۔ تقسیم کے اس عمل سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے؟
چنانچہ وہ ایک دھڑے سے جڑ کر ''ضلع جمعیۃ علماء لکھنؤ'' کے جنرل سکریٹری کے
عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے عہدہ، اور اپنی
تنظیم کے وقار کی حفاظت کرتے ہوئے پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی زبان،

اپنے قلم، اور اپنے حلقۂ احباب کے ذریعہ تنظیم کے اغراض و مقاصد کو پورا
کرنے کی جدو جہد کرتے رہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں بھی مرحوم حسین امین نے اپنی زبان اور
اپنے قلم کی حفاظت کا ''بھرم'' قائم رکھا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایک ذمہ
دارانہ عہدہ پر فائز رہتے ہوئے انہوں نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔

''جمعیۃ علماء'' بنیادی طور پر مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم ہے جس کا قیام
علمائے کرام کے ذریعہ عمل میں آیا، اور آج تک اس کے عہدیداروں اور ذمہ
داروں میں بڑی تعداد علماء کرام اور ان سے وابستہ دینی حلقوں کے مسلمانوں ہی
کی رہی —— حسین امین صاحب کو اس بات کا پوری طرح لحاظ رہا کہ ان
کے ''مخالف دھڑے'' میں بھی بڑی تعداد میں معزز و باوقار علماء کرام اور ان کے
وابستگان ہی کی ہے۔ اور اسی ''پاس ولحاظ'' کا یہ اثر رہا کہ انہوں نے اختلاف
رائے کا اظہار کرتے ہوئے بھی احتیاط کا دامن کبھی نہیں چھوڑا —— بلکہ
حقیقت تو یہ ہے کہ علم اور علماء کے احترام کے معاملہ میں تو وہ کسی ''مسلکی سرحد''
کو بھی روا نہیں رکھتے تھے؟۔

حسین امین مرحوم کی یہی وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے ان کو ایک عظیم صحافی
ہی نہیں، ایک ''عظیم انسان'' بنا دیا تھا —— اسی لئے ان کی جدائی کا صدمہ
''ہر انسان'' کو ہوا، اور یہ صدمہ دور تک اور دیر تک رہے گا۔ مگر اس قانون اور
قدرت کو تسلیم کرنے پر سب ہی مجبور ہیں کہ ؎

بھروسہ مت کرو سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
چھتیں محفوظ رہتی ہیں حویلی ٹوٹ جاتی ہے

حافظ ہاشم مرحوم

ہمارے مدرسہ (دارالعلوم فاروقیہ کاکوری) کے ہر دل عزیز استاذ جناب حافظ محمد ہاشم صاحب نے ۹؍رمضان ۱۴۲۷ھ کو صرف دس روز کے موت وزیست کی کشمکش سے نجات پاکر عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حافظ محمد ہاشم مرحوم ملیح آباد لکھنؤ کے قریب ایک گاؤں ہمراپور کے رہنے والے تھے۔ بہت کم سنی میں مدرسہ میں داخلہ لیا اور یہیں رہ کر حفظ کلام اللہ کی تکمیل کی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اسی مدرسہ میں تدریس کے رشتہ سے منسلک ہوگئے اور یہاں کے ایک درجہ حفظ کے استاذ رہے۔ اپنی سعادت مندی، مرنجاں مرنجی، خوش اخلاقی اور منکسر مزاجی کی وجہ سے نہ صرف مدرسہ کے طلبہ واساتذہ میں بلکہ کاکوری اور قرب وجوار میں بھی انہوں نے اپنی ایک شناخت بنالی تھی۔ ۳۰؍شعبان کو عصر ومغرب کے درمیان اسی مسجد میں جہاں کے وہ امام بھی تھے اور کئی برسوں سے تراویح میں قرآن مجید سنارہے تھے، اچانک چکرا کر گرگئے، نماز کے بعد انہیں اسپتال پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ ''برین ہیمبرج'' ہوگیا ہے۔ ابتداءً کئی دنوں ہوش وحواس کے ساتھ بات کرتے تھے۔ پھر غشی (کوما) طاری ہوگئی اور دوا وعلاج کی بہترین کوششوں کے باوجود فیصلہ خداوندی غالب آکر رہا۔ ۹؍رمضان کو رات ۱۲؍بجے کے بعد زندگی پر موت نے فتح

حاصل کرلی۔

عمر ابھی چالیس برس سے کم تھی، جوان العمر بیوہ کے علاوہ ۴؍بیٹے اور ایک بیٹی پسماندگان میں چھوڑے، بچے ابھی سب ہی کم سن اور نابالغ ہیں۔ حافظ صاحب مرحوم کی اچانک جدائی نہ صرف ان کے ورثاء واقرباء کے لئے بلکہ ہم تمام متعلقین کے لئے باعث الم بھی ہے اور ذریعہ عبرت بھی۔

درج بالا چند سطریں حافظ محمد ہاشم مرحوم کی وفات کے موقع پر ''تعزیتی شذرہ'' کے طور پر ماہنامہ ''البدر'' میں شائع کی گئی تھیں ——— اور اس کی بنیاد بھی حافظ صاحب مرحوم کی اس ادارہ سے نسبت تھی جس سے میرا بھی ایک ذمہ دار کی حیثیت سے رشتہ تھا۔

بات پرانی ہوگئی۔ دنیا کے دستور کے مطابق حافظ صاحب مرحوم کے گھر کی گاڑی بھی چلتی رہی، اور اب ماشاء اللہ ان کے بچے بھی جوان ہوگئے، مدرسہ میں بھی ان کی جگہ پر دوسرے استاذ کا تقرر ہوگیا، اور مدرسہ کا نظام بھی بفضلہ تعالیٰ چل رہا ہے ——— مگر حافظ ہاشم برابر یاد آتے ہیں ——— اپنی بے لوث محبت کی وجہ سے، اپنے مدرسہ کے ساتھ مخلصانہ رشتہ کی وجہ سے، اور اپنی منفرد اداؤں کی وجہ سے بھی؟۔

حافظ ہاشم مرحوم میرے شاگرد نہیں تھے لیکن ان کی طالب علمی کے دور میں میں ہی مدرسہ کا صدر مدرس بھی تھا اور عملی طور پر مہتمم بھی، اس لئے مجھ سے ان کا سابقہ پڑتا ہی رہتا تھا۔ طلبہ واساتذہ کے درمیان خلوص ومحبت کے رشتوں کا دور دورہ تھا۔ طالب علمی کا دور ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ان کا مدرسہ میں بہ حیثیت استاذ تقرر ہوگیا تھا۔ اس طرح رشتہ کا تسلسل باقی رہا۔ میرے چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم تو ان کے درجہ کے ساتھی ہونے کی وجہ سے بے تکلّف دوست تھے لیکن اپنی طبعی سعادت کی وجہ سے مجھ سے ''ادب واحترام'' کا معاملہ رکھتے تھے۔ میرے بچوں سے بڑے بھائی جیسا معاملہ رکھتے تھے۔ ان کے

انتقال کے بعد میرے بیٹے مفتی حارث عبدالرحیم سلّمہٗ نے مجھے بتایا کہ حافظ جی نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ تم باہر رہ کر تعلیم حاصل کر رہے ہو، تم میرے چھوٹے بھائی ہو، تمہارے والد صاحب میرے لئے بھی باپ کی طرح ہیں۔ ان کے اوپر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ ماشاء اللہ تم سب بھائی بہنوں کی پڑھائی لکھائی وغیرہ کا لمبا خرچ ہے۔ اس لئے تمہیں کوئی اضافی خرچ کی ضرورت ہوا کرے تو خاموشی کے ساتھ مجھ سے لے لیا کرو، یہ میرا تمہارا معاملہ ہوگا۔ اس کی اپنے والد صاحب یا کسی بھی دوسرے کو اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی اپنے گھر سے میرے لئے کوئی پسندیدہ چیز خاص طور پر دیہاتوں والی بیسن کی روٹی بنوا کر لاتے تھے اور میرے بھائی حافظ عبدالکریم کو واسطہ بنا کر مجھے کھلاتے اور خوش ہوتے۔ مزاج میں سخاوت تھی، اس لئے اپنے مدرسہ کے ساتھیوں اور درجہ کے طلبہ کو بھی کھلاتے پلاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی ساتھی کی فرمائش پر چائے منگوانے کے لئے جیب سے روپے نکالے تو وہ بالکل مڑے اور کاغذ کی گولیوں کے شکل میں تھے — میری نظر پڑی تو میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا کہ روپئے رکھنے کا یہ کون سا انداز ہے؟ یہ تو نعمت کی ناقدری ہے؟ برجستہ بولے کہ صدر صاحب! یہ روپیہ بہت بے وفا چیز ہے، کسی کے پاس ٹکتا نہیں ہے، اسے کتنے ہی ادب واحترام کے ساتھ تہہ کر کے رکھا جائے مگر یہ ٹکتا نہیں ہے — تو پھر ہم ان ''بے وفا'' کا احترام کیوں کریں؟۔

اسی طرح کی ایک دلچسپ بات انہوں نے اس وقت کہی جب ان کے یہاں چار بیٹوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹی دی۔ بیٹی پا کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے بیٹی کے لئے کافی سامان کی خریداری کی ہے۔ اس میں ایک قیمتی جھولا بھی شامل ہے۔ میں نے ان کی خوشی میں شرکت کرتے ہوئے کہا، سنا ہے کہ آپ نے بیٹی کے لئے جھولا بھی خریدا ہے؟ جواب میں مسکراتے ہوئے بولے، ہاں آپ لوگوں کی دعاؤں سے اللہ

نے بیٹی دی ہے تو اس کے لئے جھولا بھی خریدا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر بیٹی نہ ہوتی تو؟ برجستہ بولے، کہ پھر جھوّا رکھا ہے۔ اسی میں رسّی باندھ کر جھولا بنا دیتا۔ یہی سب لڑکوں کے لئے کیا ہے۔ ہم دیہات والے بچوں کے لئے ایسا ہی جھولا بنوا لیتے ہیں — یہ تو بیٹی ہے اس لئے اس کے لئے یہ اہتمام کیا ہے؟۔

میرے ساتھ انہوں نے کئی سفر بھی کئے اور بہت اچھے رفیق سفر ثابت ہوئے۔ ان کی خواہش تو یہ ہوتی کہ ہر سفر میں ان کو ہی رفیق سفر بنا کر لے جاؤں، اس سلسلہ میں ان کی یہاں تک پیشکش ہوتی کہ اپنا کرایہ میں خود دوں گا، بس آپ ساتھ چلنے کی اجازت دے دیا کیجئے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا، کیوں کہ مدرسہ میں درجہ حفظ کے استاذ ہونے کی وجہ سے مجھے ان کی ذمہ داریوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ ان کی زندگی کا میرے ساتھ آخری سفر بلگرام ضلع ہردوئی کے ایک دینی جلسہ میں شرکت کے لئے ہوا تھا، جو ان کے لئے بھی اور خود میرے لئے بھی ایک یادگاری سفر ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس سفر میں ہم لوگوں کی محیی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ سے آخری ملاقات حضرت کی وفات سے صرف پندرہ دن پہلے ہوئی تھی۔ حضرت کی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا، علالت ونقاہت کی وجہ سے کئی ہفتہ سے حضرت گھر سے باہر نکل کر مدرسہ میں بھی نہیں آئے تھے۔ میں پیشگی اجازت لے کر پہلے ہردوئی، پھر حضرت سے گھر ہی پر ملاقات کے بعد بلگرام گیا تھا۔ واپسی کے نظام کے سلسلہ میں حضرت والا نے دریافت کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ اگر کوئی زحمت نہ ہو تو صبح کو واپسی میں بھی یہاں آ کر کچھ دیر طلبہ کے سامنے بیان کر دو۔ یہاں پہنچ کر یہ خوشگوار منظر حضرت محیی السنۃ کی خردنوازی کا سامنے آیا کہ کئی ہفتہ کے بعد محض اس راقم الحروف کو نوازنے کے لئے حضرت والا گھر سے مدرسہ آئے تھے۔ بڑی بشاشت کے ساتھ حضرت نے ہم لوگوں کا استقبال کیا، اور پر تکلف ناشتہ کرانے کے بعد مجھے بیان کے لئے مسجد پہنچوا دیا۔ جہاں پہلے سے طلبہ، اور کچھ اساتذہ نیز باہری

حضرات جمع تھے۔ ابھی بیان کے لئے میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ حضرت والا خود بھی اپنی وہیل چیئر کے ذریعہ تشریف لائے اور میرے سامنے ہی کچھ فاصلہ پر رک گئے۔ اب میرے لئے یہ نا قابل بیان قسم کا ''امتحانی وقت'' تھا کہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد کیا کروں؟ ابھی گھبراہٹ اور سٹپٹاہٹ کے عالم میں کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ حضرت والا کا حکم ہوا کہ بیان شروع کیجئے —— **الامر فوق الأدب** کے تقاضے کے مطابق جو کچھ بن پڑا، حضرت کی موجودگی میں عرض کیا، لیکن حق تعالیٰ کی توفیق سے اس بات کا اہتمام کیا کہ اختصار کے ساتھ حضرت والا ہی کی زبان سے مختلف اوقات میں سنی ہوئی کچھ باتوں کو سبق کی طرح سنادوں۔ ابتدا ہی میں اس کی وضاحت بھی کردی کہ حضرت کی موجودگی میں کچھ بیان کرنے کی میرے اندر ہمت نہیں ہے، مگر حضرت کا حکم ہے تو ان ہی سے سنی ہوئی کچھ باتوں کو دوہرانے کی کوشش کروں گا۔

حق تعالیٰ کے فضل وکرم اور حضرت کی خصوصی توجہ کے نتیجہ میں کچھ ایسا بیان ہوگیا کہ حضرت والا بہت محظوظ ومطمئن ہوئے اور بیان کے بعد مجھے گلے لگا کر بہت دعائیں دیں۔

میں تو جیسے تیسے اس ''امتحانی مرحلہ'' سے گذر کر واپس آ گیا۔ لیکن بعد میں کچھ احباب خصوصاً حضرت کے منظورِ نظر مسترشد ومجاز جناب مولانا افضال الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی سے یہ علم ہوکر اپنی قسمت پر ناز ہوا کہ میرا وہ بیان ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ محفوظ کرلیا گیا تھا، اور میری واپسی کے بعد بھی حضرت والا نے اسے سنا اور دوسروں کو سنوا کر میرے لئے حوصلہ افزا کلمات فرماتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔

اس طرح یہ سفر حافظ ہاشم ہی کے لئے نہیں، خود میرے لئے بھی ایک ''یادگار سفر'' بن گیا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ اس سفر کے پورے پندرہ دن کے بعد ہی حضرت والا کی وفات ہوگئی۔

اس سفر کے تعلق سے ایک دلچسپ بات قابل ذکر یہ بھی ہے کہ ہردوئی پہنچ کر اور حضرت والا سے ملاقات کے بعد بلگرام جاتے اور واپس آتے ہوئے حافظ ہاشم مرحوم نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ آپ سفارش کر کے مجھے حضرت والا سے بیعت کرادیجئے —— مگر میں حضرت کے اصول وضوابط سے کچھ واقفیت رکھنے کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں کرسکا، اور میں نے ان سے یہی کہا کہ اگر ایسا ارادہ ہوا تو خاص طور پر ہردوئی کا اسی غرض سے سفر کریئے، اپنی درخواست پیش کریئے۔

پھر قضا وقدر کے فیصلہ نے اس کی مہلت نہیں دی، اور حافظ ہاشم مرحوم ارادہ رکھنے کے باوجود نہ ہردوئی جاسکے، نہ ہی ان کی حضرت والا سے بیعت کی چاہت پوری ہوسکی۔

حضرت کی وفات کے بعد حافظ صاحب مرحوم نے مجھ سے متعدد مرتبہ شکایت آمیز انداز میں کہا کہ آپ کی وجہ سے ہی میں اس سعادت سے محروم رہا —— اور میں اس کے سوا ان سے کیا کہہ سکتا تھا کہ ؂

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں، پھر بھی کم نکلے

اب ہماری اس دنیا میں نہ حضرت محیی السنۃ موجود رہے، نہ ہی ان کے طلب گار حافظ ہاشم صاحب مرحوم! مگر صالحین سے محبت اور ان سے مربوط رہنے کی خواہشیں وکوششیں ان شاءاللہ حافظ صاحب کے ضرور کام آرہی ہوں گی۔

اپنے تعلق سے اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ کچھ تو ایسی ادائیں ضرور تھیں حافظ ہاشم صاحب کی کہ ؂

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

فرحمہ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

بھائی سید ضیاء الحسن صاحب
رفتید و لے نہ از دل ما

خوش جمال، خوش خصال، اور خوش گفتار بھائی سید ضیاء الحسن صاحب بھی ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کے بہت قریبی حلقہ کے لوگوں میں تھا، مگر یہ ضرور ہے کہ میں نے انہیں ہمیشہ قمر اور ان کے دیگر بھائی بہنوں کی طرح بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کیا، اور انہوں نے بھی جواب میں چھوٹے بھائی کو اپنی شفقتوں سے نوازا۔

میری ان سے تعلق و رشتہ کی کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں میرا داخلہ مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ کے درجہ حفظ میں کرایا گیا، جہاں سے پہلے میری تکمیل حفظ قرآن کی اور ۱۹۶۲ء میں تجوید قرآن (بروایۃ حفصؒ) کی دستار بندی ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب اس مدرسہ کے ناظم بھائی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم تھے اور بھائی صاحب کے چھوٹے بھائی سید قمر الحسن صاحب اسی مدرسہ کے دوسرے درجہ حفظ کے طالب علم تھے۔ یہاں سے میری اور قمر کی دوستی شروع ہوئی جو بعد میں کافی پروان چڑھی اور اس کا سلسلہ کم از کم اس وقت تک ترقی پذیر رہا جب قمر تو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شبلی ہاسٹل میں رہ کر اور میں دار العلوم دیوبند جا کر

اپنے اپنے تعلیمی مراحل طے کرتے رہے، اور ہم دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ مضبوط ہوتا رہا۔ اس وقت کے مدرسہ تجوید الفرقان کا ایک شعبہ نسواں بھی تھا، جو مدرسہ کے عقب جانب مشرق حاجی فقیر محمد صاحب مرحوم (بانی مدرسہ) کی اس کوٹھی میں چل رہا تھا جو موجودہ وقت میں حاجی صاحب مرحوم کے فرزندان بھائی حاجی محمد علی صاحب وغیرہ کی رہائش گاہ ہے۔

اس نسواں مدرسہ (یا اسکول) میں جہاں درجہ پنجم تک تعلیم ہوتی تھی بھائی صاحب مرحوم کی دو چھوٹی بہنیں سلمٰی باجی اور نجمہ مرحومہ، اور میری ایک بڑی بہن صفورہ اور چھوٹی بہن عفرا بھی پڑھتی تھیں، جہاں ان لوگوں کی بھی علی قدر مراتب خوب پکی دوستیاں ہو گئی تھیں۔ اس مدرسہ نسواں کے بھی ناظم و نگراں مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم ہی تھے (جو ہمارے دور طالب علمی ہی کے درمیان اس مدرسہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے تھے اور بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے درجات عربی کے مؤقر استاذ مقرر ہو گئے تھے)

میری اور قمر، اور ہم دونوں کی دونوں بہنوں کی دوستیوں نے خوب خوب رنگ جمایا۔ چھٹی کے دنوں میں خاص طور پر جمعہ کے دن اکثر ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر دن بھر کے لئے جاتے، دوپہر کا کھانا ساتھ کھاتے، خوش گپیاں کرتے، ہم اور قمر اپنے مشترکہ شوق بچوں کی کتابوں کا تبادلہ کرتے ـــــ اور ہم سب کے بڑے، بھائی صاحب مسکرا مسکرا کر ہماری حوصلہ افزائی کرتے اور ضرورت پڑنے پر ہلکی پھلکی تنبیہ بھی کرتے۔ بھائی صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، بھابھی صاحبہ کا حیدرآبادی لب ولہجہ اور کچھ بدلے ہوئے الفاظ و اصطلاحات سے ہم لوگ خوب محظوظ ہوتے تھے اور اکثر بھائی صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر ہماری خوشیوں و لذتوں میں اضافہ کرتے تھے۔ ان دنوں بھائی صاحب اور ان کا کنبہ محلّہ ارادت نگر، ڈالی گنج کے ایک کرایہ کے مکان میں قیام پذیر تھا۔ والدہ ماجدہ کی وفات ہو چکی تھی، اور والد صاحب ''خود اختیاری گوشہ نشینی'' لے کر زیادہ تر ذکر و اذکار یا مطالعہ میں مشغول رہ کر ہم کو

"ہماری آزادیوں" کے لئے موقع فراہم کردیا کرتے تھے۔

داستان خاصی طویل اور دلچسپ ہے (شاید اسے کبھی قلم بند کرنے کا موقع مل جائے) یہاں بہ طور اختصار اس خصوصی اہمیت کی حامل بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہماری اور ہماری بہنوں کی دوستیوں پر تو وقت کی رفتار نے گرد کی تہیں جما دیں۔ قمر دہلی جا بسے، بہنوں کی شادی بیاہ نے انہیں دور دور کر دیا—— مگر بھائی صاحب مرحوم کی شفقتیں مجھے تادم آخر حاصل رہیں—— اس فرق کے ساتھ کہ اب وہ مجھے تم کے بجائے آپ سے مخاطب کرنے لگے تھے، اور جب جب میں نے اس پر اپنا اعتراض درج کرایا تو انہوں نے مجھے میرے عالم وغیرہ ہو جانے کا حوالہ دے کر مجھے خاموش تو کر دیا لیکن مطمئن نہ کر سکے؟ ع

اے کاش کہ وہ دن واپس آتے

بھائی صاحب میری تحریروں کے میری بساط سے زیادہ قدر دان تھے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً میرے رسالہ "البدر" کا اور میری کتابوں کا بڑے شوق وانہماک سے مطالعہ کیا اور میرے طرز نگارش پر انہوں نے جس جس طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا وہ میرے لئے اس وجہ سے سند کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ خود ایک وسیع النظر اور کثیر المطالعہ مصنف، ادیب، دانشور، اور با فیض استاذ و مربی تھے۔

آخر میں بھائی صاحب سے آخری ملاقات کا ذکر کر کے اپنی اس تشنگی کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں جو ان شاءاللہ اس وقت دور ہو گی جب ہم دونوں جنت میں جمع ہوں گے اور بھائی صاحب یہ کہہ کر مجھے دلاسہ دیں گے کہ "لو اب تو خوش ہو گئے؟"۔ اس فانی دنیا میں ہماری آخری ملاقات کچھ یوں ہوئی کہ میرے پھوپھی زاد بھائی طارق سلّمہٗ نے مجھے بتایا کہ ضیاء صاحب کا قلبی آپریشن ہونے والا ہے جس کے لئے وہ تین دن کے بعد ایراز ہاسپٹل میں داخل ہوں گے، انہوں نے سلام کہلوایا ہے اور دعا کے لئے کہا ہے۔ میں یہ تشویش ناک اطلاع پا کر دوسرے ہی دن ان کے گھر گیا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا ارے بھائی میں نے تو دعا کے لئے کہلوایا تھا آپ نے آنے کی زحمت کیوں کی

(اس میں بھی یقیناً وہ شفقت شامل تھی جو میرے گھٹنوں کے درد کی معذوری کی وجہ سے وہ میرے ساتھ خصوصی طور پر روا رکھتے تھے) بہ ہر حال مختصر گفتگو اور دلاسہ و تسلی کے بعد انہوں نے مجھ سے میری کتاب "یادوں کے جھروکوں سے" کے مطالعہ کا اشتیاق ظاہر کیا—— میں نے ممکنہ عجلت کے ساتھ طارق سلّمہٗ کے ذریعہ ان تک یہ کتاب پہنچوا دی مگر معلوم نہیں کہ وہ اس کی ورق گردانی کر بھی سکے یا نہیں؟۔ واپسی کے وقت انہوں نے مجھے تھوڑے سے انگور اپنے پاس رکھے، ایک لفافہ کو خالی کر کے باصرار یہ کہہ کر دیئے کہ "میری طرف سے بچوں کو دے دینا"۔ یہ تھا ان کا آخری شفقت سے بھرپور تحفہ یا رویہ!

اللہ بس باقی ہوس—— حق تعالیٰ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

سید ضیاء الحسن مرحوم (جنہیں میں ۱۹۶۰ء کی دہائی سے ان کی وفات تک "بھائی صاحب" سے مخاطب کرنے کا عادی رہا) سے میری ذاتی واقفیت اور ان کی بزرگانہ شفقتوں سے بہرہ ور ہونے کی مدت تو اتنی ہی ہے جتنی میرے بچپن، اور بچپن سے جوانی، اور اب جوانی سے بڑھاپے تک پہنچنے کی مدت ہے۔ اس دوران بہت قربتیں بھی رہیں، اور لمبے لمبے وقفوں کی ملاقاتیں بھی رہیں—— مگر ایک چیز ہمیشہ برقرار رہی کہ وہ جب اور جتنے وقفہ کے لئے بھی ملے، مجھے "اپنائیت" کا وہ احساس دلاتے رہے جس کی وجہ سے ان کی ہر ملاقات میرے لئے "تجدید محبت" کا کام کرتی رہی۔

اب جب کہ وہ ہماری اس فانی دنیا سے منھ موڑ کر اس طرح رخصت ہو گئے کہ یہاں ان سے مختصر سے مختصر ملاقات بھی نہیں ہو سکتی، اور ان کے صحیح واقفین وقدردانوں نے ان کی وفات پر اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی "علمی فتوحات" کا اشاروں اشاروں میں کسی تفصیل کے بغیر ذکر کرتے ہوئے مجھے خواب غفلت سے بیدار ہونے کا موقع فراہم کیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میرا ساٹھ برس سے زیادہ طویل مدت پر مشتمل رشتہ بس بھائی صاحب سے شروع ہو کر بھائی صاحب ہی پر ختم ہو گیا—— اور حیرت کے ساتھ ساتھ

حسرت کی یہ سوغات بھی دے گیا کہ انہوں نے تو میری قدر دانی بھی کی اور وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی بھی کی، لیکن میری محرومی یہ کہ میں ان کے ''قد'' ہی کو نہیں پہچان سکا تو قدر دانی کیا کرتا؟

میں نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی، اور اپنے ارد گرد جن پڑھے لکھے اور ''باکار لوگوں'' کو پایا ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں ہی کی پائی جنہیں اپنی ''عظمتوں کے قصیدے'' بیان کرنے کے لئے اپنی ہی زبان یا اپنے ہی قلم کا بے تکلف استعمال کرتے ہوئے دیکھا، جنہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنے آپ کو مخزن علم و ادب، صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز اور رموز آشنا و قادرالکلام شاعر ہی نہیں، بلکہ ضرورت پڑنے پر علامہ، مفتی، قائد، اور مصلح دوراں تک بنا کر پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ——— پھر قسمت نے یاوری کی تو ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' والا حلقۂ یاراں بھی مل گیا، اور دیکھتے دیکھتے انہیں ''واقعی عظیم'' تسلیم کرلیا گیا۔ اور کچھ وہ بھی آئے جن کی قسمت نے ان کے ساتھ مہربانی کا معاملہ نہیں کیا اور وہ جھنجھلا کر دنیا کی ناقدری اور مایوس ہوکر ادب و ادیب، نیز علم اور عالم کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہوئے رہ گئے؟۔

جیسا کہ میں نے سطور بالا میں عرض کیا کہ بڑی تعداد تو میں نے ان ''بقلم خود'' لوگوں ہی کی پائی، تاہم ان ''چھوٹی تعداد'' کے لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، انہیں پایا اور برتا بھی، جنہوں نے اپنا تعارف خود نہیں کرایا بلکہ وہ اپنے کارناموں اور صلاحیتوں کے ذریعہ اپنی زندگی ہی میں نہ صرف متعارف بلکہ ''مسلّم'' ہوگئے؟۔

بھائی صاحب مرحوم کے قدردانوں اور ان کے مرتبہ شناسوں سے معذرت کے ساتھ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں بھائی ضیاء الحسن صاحب کا شمار پڑھے لکھے اور باکار لوگوں کی درج بالا قسموں میں سے کسی میں نہیں کیا جاسکتا ——— اور شاید اسی لئے وہ میرے جیسے ''آشنائی کے دعویدار'' کے لئے بھی ''غیر متعارف'' ہی رہے اور میں انہیں بھائی صاحب

ہی کہتا رہ گیا۔

باہمہ ذوق آگہی ہائے یہ نسبتی بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

خدا بھلا کرے بھائی صاحب کے چھوٹے بھائی اور میرے عزیز دوست سید قمرالحسن کا کہ جنہوں نے بھائی صاحب کی علمی میراث تک پہنچ کا سامان اس طرح کردیا کہ انہوں نے اپنے برادر معظم کی وفات کے فوراً ہی بعد اپنی ایک ''وہاٹس ایپ پوسٹ'' کے ذریعہ یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ جلد بھائی صاحب کے حالات زندگی پر ایک کتاب مرتب کرکے شائع کرنا چاہتے ہیں، بھائی صاحب کے حلقۂ احباب سے یہ اپیل کی کہ مرحوم کے سلسلہ میں اپنے تأثرات ان کے احباب و رفقاء اور اعزہ و اقرباء مجھے بھیجیں تاکہ انہیں اس مجوزہ کتاب میں شامل کیا جاسکے۔ عزیز بھائی سید قمرالحسن نے (جنہیں مساویانہ طور پر اب دوست کہتے ہوئے بھی اس لئے جھجھک ہورہی ہے کہ ان کے سلسلہ میں یہ بھی دریافت ہوئی کہ موصوف بھی کئی کتابوں کے مصنف ہوکر ''ادیبوں و دانشوروں'' کے زمرہ میں داخل ہوچکے ہیں ——— یعنی۔

پوچھ لیتے تھے کبھی جو خاکساروں کا مزاج
کہتے ہیں وہ لوگ بھی اب صاحب محفل ہوئے

مجھ پر یہ خصوصی عنایت کی کہ مجھ سے باصرار کہا کہ تم بھی بھائی صاحب پر ایک ایسا مضمون لکھو جس میں کچھ ان کے احوال ہوں، اور میری درج بالا اس فوری اور مختصر تأثراتی تحریر کو اس لئے ناکافی قرار دیا کہ اس میں تو صرف گھریلو رشتوں اور تعلقات کا ذکر ہے ——— بھائی قمر کی اس تجویز نے میرے اندر بھی تحریک پیدا کی، لیکن رکاوٹ وہی اپنی غفلت و بے خبری تھی جس نے سید ضیاء الحسن مرحوم کی اس حیثیت کو اب تک مجھ سے اوجھل رکھا تھا ——— اس رکاوٹ کو ''لاک ڈاؤن'' کے باوجود بھائی قمرالحسن نے بھائی صاحب کی چار کتابیں فوری طور پر فراہم کرکے دور کردیا۔

اس طوالانی تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان چار کتابوں ''غبار قلم''، ''حیات نور''، ''شاہ مصطفیٰ علی اثیر — حیات اور شاعری، اور قدوائیوں کے مورث اعلیٰ — ایک تحقیقی مطالعہ'' کے سرسری مطالعہ نے ہی مجھ پر ایک نئے سید ضیاء الحسن کا انکشاف کیا، اور میں اس اعتراف پر مجبور ہوگیا کہ ؎

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بہ ہر حال ''صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے'' کے مصداق ان چار دستیاب کتابوں ہی کی روشنی میں ان کے مصنف و مرتب سید ضیاء الحسن مرحوم کے سلسلہ میں اپنے تاثرات بعجلت تمام اس لئے تحریر کر دینا مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں کہ مبادا اس ''نئے انکشاف'' کے بیان کی راہ میں میرا ''مرحوم'' ہو جانا رکاوٹ نہ بن جائے —— قمر کی مجوزہ کتاب کی اشاعت کب ہو سکے گی؟ ''لاک ڈاؤن'' کے ہوتے اس کا کوئی متعین اور صحیح جواب تو نہیں دیا جا سکتا، لیکن پہلے نمبر پر سید ضیاء الحسن مرحوم کے مجموعہ مضامین بہ عنوان ''غبار قلم'' کا ذکر اس لئے کہ یہ خالص ان ہی کے متنوع و مختلف مضامین کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے، جس کا اپنے پیش لفظ میں تعارف کراتے ہوئے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے جناب عمیر منظر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ

''جناب ضیاء الحسن صاحب کی کتاب ''غبار قلم'' مختلف مضامین کا مجموعہ ہے مگر مختلف مضامین کو اس طرح مجموعہ کی شکل دی گئی ہے کہ اس سے لکھنؤ، اردو تہذیب اور ثقافت کا رنگ نمایاں ہوگیا ہے............صفحہ ۸''

کتاب کے مطالعہ سے سید ضیاء الحسن صاحب کی منفرد طبیعت اور ہمہ جہت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ چوں کہ وہ ایک عرصہ تک درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں، اس لئے بہت سی چیزیں انہوں نے طلبہ کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھی ہیں اور ایسے

مضامین بھی جو ہمارے ادب کا حصہ ہیں''............ص ۹

اس کتاب میں شامل دو مضامین ''پدماوت اور ذکر رسول'' اور ''۱۹۶۸ء کا ایک مشاعرہ اور ملک زادہ صاحب کی نظامت'' نے خصوصی طور پر مجھے متاثر کیا۔ اس لئے نہیں کہ ان دونوں مختصر مختصر مضمونوں میں کوئی بہت اہم اور تحقیقی بات لکھ دی گئی ہو، بلکہ اس لئے کہ ملک محمد جائسی کی ''پدماوت'' سے دو ایسے دوہوں کا انتخاب کر کے ان کو اپنا موضوع گفتگو بناتے ہوئے ان کی بہت ہی والہانہ انداز میں تشریح کرنا جن میں سے ایک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر جمیل کی اہمیت اور کلمۂ توحید کی ضرورت وافادیت کے بیان پر مشتمل ہے اور دوسرا ان کے خلفائے راشدین کے ذکر جمیل پر مشتمل ہے۔ یقیناً یہ انتخاب مضمون نگار کے نہ صرف اپنے دین و مذہب سے گہری وابستگی، بلکہ اس مذہبی شعور کا بھی غماز ہے جو انہیں اپنے گھریلو ماحول سے لے کر علمی مدارج طے کرنے تک ملا تھا—— چنانچہ اس سلسلہ میں خود مضمون نگار دوسرے قطعہ پر اپنے تبصرہ کا آغاز کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''یہاں تک تو ''پدماوت'' میں ذکر رسول ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذکر رسول اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک آپ کے چہیتے رفقاء یعنی خلفاء ذی وقار ''ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ'' کا تذکرہ شامل نہ کیا جائے۔ کیوں کہ یہی تو ان کا عکس اور نمونہ ہیں اور انہیں چاروں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ حدیث میں ہے ''اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم یعنی میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں جنہوں نے ان کی اتباع کی وہ ہدایت پاگئے۔''ص ۱۵

اسی طرح دوسرے مضمون کا معاملہ ہے جن میں انہوں نے بین الاقوامی شہرت وعظمت کے حامل ''ناظم مشاعرہ'' ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمدؒ کی کامیاب وساحرانہ نظامت کو پہلی مرتبہ الہ آباد میں سننے اور گرویدہ ہونے کی روداد بیان

کرنے کے ساتھ ہی ملک زادہ صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بہت ہی نپے تلے الفاظ میں ان سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے ـــــ اس مضمون کی خاص بات جو مضمون نگار کی ذہانت وجودت کو ظاہر کرنے والی ہے، وہ ہے جس کو خود مضمون کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

''یہاں ایک بات لکھنا چاہ رہا ہوں وہ یہ کہ ۲۲؍اپریل ۲۰۱۶ء یعنی ملک زادہ صاحب کے انتقال کے بعد ان سے متعلق کئی مضامین نظر سے گذرے تقریباً ہر مضمون میں ایک بات مشترکہ نظر آئی یعنی ''ملک زادہ کا میدان کار صرف مشاعروں کی نظامت ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک عالم و فاضل، ادیب ونقاد اور باکمال شاعر بھی تھے۔ان کا اپنا ادبی سراپا بہت بلند تھا'' ان جیسے جملوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ حضرات ''نظامت'' کو ایک کمتر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں، حالاں کہ ''نظامت'' کوئی معمولی چیز نہیں ہے اور یہ ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں .... نظامت کے لئے دوراندیشی، دوربینی، بے باکی، برجستگی، اور حق گوئی کی ضرورت ہوتی ہے .... کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ملک زادہ منظور صاحب کی شہرت نظامت ہی کی رہین منت ہے۔ کیا ان جیسی نظامت ہر ایک کرسکتا ہے؟ .... ملک زادہ صاحب کی ایک درجن سے زائد کتب، ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالے، تنقیدی مطالعے، خودنوشت سوانح عمری اور شعری مجموعے بلاشبہ اہم ہیں .... لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ ''نظامت'' نے ہی انہیں عوام وخواص دونوں سے روشناس کرایا اور اسی نظامت کے ذریعہ ہی انہیں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔'' ص ۱۰۰-۹۹

مضمون نگار نے جس پختگی، اعتماد اور وثوق کے ساتھ ملک زادہ صاحب

مرحوم کی نظامت کو ان کے تمام تر علمی وادبی ورثہ کے مقابلہ میں دلائل کے ساتھ ان کا ''وصف امتیازی'' قرار دیا ہے۔اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن مضمون نگار کی وسعت نظر اور تجزیہ نگاری کی بھرپور صلاحیت سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرے نمبر پر ان کی کتاب ''قدوائیوں کے مورث اعلیٰ ـــــ ایک تحقیقی مطالعہ'' کا ذکر اس لئے کہ یہ کتاب ان کی تحقیق وجستجو، کثرت مطالعہ، اور مراجع و مآخذ سے استفسار و استشہاد کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ صرف ۶۰؍صفحات مشتمل یہ کتاب ''بہ قامت کہتر وبہ قیمت بہتر'' کی مصداق ہے۔

لکھنؤ کے اطراف خصوصاً ضلع بارہ بنکی کے مختلف مواضعات میں مسلم شرفاء کا ایک مشہور خانوادہ ''قدوائی'' کے نام سے آباد ہے جس کے مورث اعلیٰ شیخ معزالدین المعروف بہ ''قاضی قدوہ'' تھے۔ ماضی قریب کی اہم علمی، ادبی وسیاسی شخصیات میں مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ، مولانا عبدالسلام قدوائیؒ، رفیع احمد قدوائیؒ، شفیق الرحمٰن قدوائیؒ اور اخلاق الرحمٰن قدوائیؒ وغیرہم کا تعلق اسی خانوادہ سے تھا۔ موجودہ علمی، ادبی وسیاسی بساط پر بھی اس خانوادہ کے متعدد افراد، اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔

قدوائیوں کے مورث اعلیٰ قاضی قدوہ کے سلسلہ میں درج ذیل چند باتیں معروف ومسلّم ہیں:

ان کا اصل نام معزالدین تھا۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خواجہ تاش تھے یعنی دونوں ہی حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ سے بیعت ومجاز تھے۔ ان کا تعلق رومی سلاطین کے خاندان سے تھا۔ وہ اپنے پیرومرشد کے حکم وایماء سے شہاب الدین غوری کے عہد سلطنت میں ہندوستان آئے اور یہاں اولین قیام اپنے خواجہ تاش حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے پاس اجمیر میں کیا۔ بادشاہ وقت نے ان کے علمی اور روحانی وعرفانی مقام کی قدر کرتے ہوئے انہیں

منصب قضاء پر فائز کیا، اس طرح وہ ''قاضی قدوہ'' کے نام سے ایسا مشہور
ہوئے کہ یہی لقب ان کی شناخت بن گیا اور ان کے اصل نام سے واقفیت کم ہی
لوگوں کو رہ گئی۔ وہ ایک کثیر الاولاد بزرگ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی
اولاد کی کل تعداد ۷۰ رتو دوسری روایت کے مطابق ۵۲ رتھی اور اسی مناسبت سے
بارہ بنکی میں ایک مثل مشہور ہے ''باون گاؤں قدوارہ'' سب سے بڑا بھیارہ''۔
بادشاہ وقت نے ان کی قدر افزائی کرتے ہوئے ان کے ہر بچے کے نام سے
ایک موضع بطور جاگیر عطا کی تھی، جہاں آج بھی قدوائی خاندان کے کم یا زیادہ
افراد آباد ہیں۔

اسی طرح قاضی قدوہ کے سلسلہ میں چند باتیں ایسی ہیں جو اختلافی و
نزاعی ہیں اور ان کے مختلف سوانح نگاروں کی آراء کے درمیان اختلاف ہے:

مثلاً زیادہ تر سوانح نگاران کے آباء واجداد کے نام اور ان کے احوال کا
پتہ نہیں لگا سکے، جب کہ مشہور عالم و محقق مولانا عبد السلام قدوائی نے اپنے شجرہ
میں قاضی قدوہؒ کے والد کا نام میرک شاہ اور دادا کا نام سلطان ابوعلی درج کیا
ہے؟ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا ماخذ کیا ہے اور دیگر
تمام سوانح نگاروں اور دوسرے مقام پر خود اپنے ہی اس بیان کے برعکس کہ
قاضی قدوہ کے آباء واجداد کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہے، اس شجرہ میں انہوں نے
ان کے باپ دادا ہی نہیں حضرت آدم علیہ السلام تک تمام بزرگوں کے نام کہاں
سے درج کئے اور ان کی تصدیق کیوں کر ہو؟ عموماً تمام مؤرخین و محققین نے
قاضی قدوہ کا شمار شیوخ میں کیا ہے، جب کہ بعض حضرات نے ان کا شمار
سادات میں کیا ہے؟ قاضی قدوہؒ کی جائے قیام اجودھیا (جہاں ۱۹۹۲ء تک ان
کی قبر بھی موجود تھی) پہلے سے ایک آباد بستی کی صورت میں موجود تھی، اور بادشاہ
وقت نے انہیں وہاں کا قاضی مقرر کیا تھا، جب کہ بعض دیگر حضرات کے مطابق
قاضی قدوہ ہی نے اجودھیا کو آباد کر کے ایک بستی کی صورت عطا کی تھی؟ سب
سے بڑا اختلاف ڈاکٹر کبیر احمد نے کیا ہے، جس کی تفصیل میں سید ضیاء الحسن

صاحب یوں رقم طراز ہیں:

''حضرت قاضی قدوہؒ کے بارے میں مختلف کتب تواریخ میں جو
کچھ موجود ہے، اس کی صحیح سند نہ ملنے اور تصدیق نہ ہونے کی وجہ
سے بعض حضرات اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر
کبیر احمد لکھتے ہیں ''قاضی قدوہ کے متعلق کوئی تفصیل یا
معلومات مؤلف کو حاصل نہ ہوسکیں اس لئے قاضی صاحب کی
تاریخی شخصیت کی حیثیت مبہم ہوجانے کی وجہ سے ان سے
منسوب اور متعلق دیگر باتیں مشکوک سمجھنے میں کسی کو روکا نہیں
جاسکتا۔'' ص ۴۳

مندرجہ بالا عبارت کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف حاشیہ پر
مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

''معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوہ نامی شخص کا شہر اودھ
(اجودھیا) میں بطور حاکم یا قاضی شہر آنا ثابت نہیں نیز متذکرہ
بالا حوالہ میں تقریباً نوسو سال پہلے کا واقعہ بتلایا گیا ہے۔ اور اس
زمانہ میں شہر اودھ (اجودھیا) میں مسلمانوں کی تھوڑی سی آبادی تو
ضرور تھی لیکن اس شہر کی حیثیت ''اسلامی اسٹیٹ'' جیسی تو تھی نہیں
جس میں ''قاضی شہر'' رہتا تھا اور جو مسلمانوں کے متنازعہ مسائل
اور معاملات کا اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتا تھا''۔ صفحہ ۴۴

ڈاکٹر کبیر احمد صاحب ''تاریخ گم گشتہ حالات اجودھیا'' پہ تنقید
کرتے ہوئے آگے یوں رقم طراز ہیں:

''پتہ نہیں مؤلف کتاب نے بلا تحقیق و سند کیوں کر لکھ دیا کہ آپ
بطور حاکم یا قاضی شہر اجودھیا میں تشریف لائے تھے؟ مؤلف کو
چاہئے تھا کہ وہ تحقیق کے ساتھ یہ تحریر فرماتے کہ فلاں بادشاہ کے
وقت میں یہ فلاں جگہ سے آئے تھے اور فلاں عہدہ پر کام کرتے

تھے۔'' صفحہ ۴۵

ڈاکٹر کبیر احمد صاحب کی مندرجہ بالا تحریروں سے تو قاضی قدوہ کا وجود ہی مشکوک ہے۔ (قدوائیوں کے مورث اعلیٰ......صفحہ ۲۳-۳۳)

قدوائیوں اور ان کے مورث اعلیٰ قاضی قدوہؒ سے متعلق درج بالا تمام باتیں سید ضیاء الحسن مرحوم کی اسی کتاب سے ماخوذ ہیں، جن سے مؤلف کی تحقیق وجستجو اور اپنے موضوع سے متعلق دستیاب مواد سے استفادہ کے لئے جدوجہد کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے — اس کتاب کے مطالعہ سے راقم الحروف پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہمارے ملک ہندوستان کے نجیب وشریف عجمی النسل مسلم خانوادوں میں قدوائیوں اور ان کے مورث اعلیٰ کے احوال وکوائف کے سلسلہ میں اہل علم وفضل نے جتنی تحقیق وجستجو کی ہے شاید ہی کسی دوسرے خانوادہ کے لئے اتنی کوشش کی گئی ہو— تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خود قاضی قدوہؒ کے حسب ونسب حتیٰ کہ ان کے آباء واجداد کے ناموں تک بھی رسائی حاصل نہیں کی جاسکی، جب کہ خود ان کے اور ان کے اخلاف کے علمی، ادبی، سیاسی، اور سماجی کارناموں، اور ان کے فضل وکمال سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے؟

ان دو کتابوں کے کچھ تفصیلی ذکر کے بعد سید ضیاء الحسن مرحوم کی دستیاب دیگر دو کتابوں ''شاہ مصطفیٰ علی اثیر —— حیات وشاعری'' اور ''حیات نور'' کا سرسری ہی سہی تذکرہ مناسب ہوگا—— اگرچہ یہ دونوں کتابیں اول الذکر دو کتابوں کے مقابلہ میں ضخیم بھی ہیں اور راقم الحروف کے ذوق مطالعہ سے کافی ہم آہنگ بھی۔ خصوصاً ''حیات نور'' تو وہ کتاب ہے جس سے ایک جذباتی لگاؤ بھی ہے، کیوں کہ یہ کتاب بھائی ضیاء الحسن صاحب کے والد ماجد اور ہمارے اولین محبوب ''ناظم صاحب'' کے حالات زندگی کے بیان پر مشتمل ہے، اور اس کی ترتیب میں ضیاء الحسن صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے بھائی اور

ہمارے عزیز دوست سید قمر الحسن صاحب بھی برابر کے، بلکہ کچھ بڑھ چڑھ کر شریک رہے ہیں—— تاہم چوں کہ اس تحریر میں کتابوں پر تبصرہ نہیں، بلکہ سید ضیاء الحسن مرحوم کے حوالہ سے ان کی چند کتابوں کا تذکرہ ہی مقصود ہے۔ اس لئے ان دونوں کتابوں کے سرسری ذکر ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مشہور اور قد آور شخصیات پر لکھنا آسان بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات لکھنے والا خود بھی اسی ذریعہ سے متعارف ومشہور ہوجاتا ہے، جب کہ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیروں کو تلاش کرنا اور انہیں جاذب نظر بنا کر پیش کرنا ''جوہر شناسی'' کی صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں ہے؟۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی ''نفع عاجل'' کا طلب گار اس ''کار دشوار'' کو انجام دینے کا ارادہ نہیں کرسکتا۔ اس کام کا بیڑا اٹھانے کی ہمت وہی کرسکتا ہے جس کا کاغذ وقلم کے ساتھ رشتہ مخلصانہ بھی ہو، اور اس وسیلہ سے وہ شہرت کے بجائے احساسات کی ترجمانی اور فرض کی ادائیگی کا طالب ہو؟ —— شاہ مصطفیٰ علی اثیر کی حیات وشاعری پر کوئی باقاعدہ کتاب لکھنا، اور ان کی شاعرانہ عظمت کو دل میں بساتے ہوئے ان کے منتشر وغیر مرتب کلام کو حاصل کرکے، اسے ترتیب وتدوین کے مراحل سے گذار کر باقاعدہ شائع کرانا، سید ضیاء الحسن صاحب کا ''ایک کارنامہ'' اس لئے قرار دیا جائے گا کہ ایک نسبتاً گمنام لیکن خدا رسیدہ شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام سے اس درجہ کے شغف وانہماک کو ''نفع عاجل'' سے نظریں ہٹا کر حق دار کو اس کا حق دلانے کی ایک ''سعی مشکور ومحمود'' کے سوا کسی دوسرے نام سے یاد نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا شوق کے ساتھ مطالعہ صاحب کتاب یعنی ''شاہ مصطفیٰ علی اثیر'' یا مرتب کتاب یعنی ''سید ضیاء الحسن صاحب'' کے مخصوص حلقوں میں ہی کئے جانے کی توقع ہے۔ اور اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اس کتاب کی تالیف اور ترتیب وتدوین میں اپنی توانائیاں صرف کرنا، مؤلف ومرتب کے ''اخلاص نیت'' کا غماز ہے۔ حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

جہاں تک دوسری کتاب ''حیات نور'' کا معاملہ ہے تو اس کی فہرست مضامین پر نظر ڈالتے ہی ایک آرزو یہ پیدا ہوئی کہ ''بھائی صاحب، اوران سے زیادہ کتاب کے دوسرے مرتب سید قمرالحسن کوراقم الحروف کی یاد بھی آ گئی ہوتی تو اسے بھی ''احسان شناسوں'' کی فہرست میں جگہ مل گئی ہوتی؟۔اس کتاب کی طلب وجستجو تو کافی عرصہ سے تھی، مگر مطالعہ کا موقع اب مل سکا—— اور وہ بھی سرسری۔ کیوں کہ باقاعدہ تفصیلی مطالعہ جستہ جستہ ان شاء اللہ کروں گا۔ کتاب بہت خوب ہے —— اور یہ ہونا بھی چاہئے، کیوں کہ کتاب کے دونوں مرتبین، صاحب کتاب یعنی مولانا سید نورالحسن صاحب مرحوم کے فرزندان ہیں۔اوراس جذباتی رشتہ کونباہنے اوراس کا حق ادا کرنے میں اپنی جانب سے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

اس کے باوجود خاص وجہوں سے یہ کتاب میرے لئے ''غیر متوقع'' ثابت ہوئی—— پہلی وجہ یہ کہ میں اس کتاب کی زیارت وسرسری مطالعہ سے پہلے تک یہ سمجھتا تھا کہ اس کتاب کے مؤلف ومصنف تنہا سید ضیاءالحسن صاحب ہیں، جب کہ یہ میری غلطی یا ناسمجھی ثابت ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اسے مولانا سید نورالحسنؒ کی ایک باقاعدہ سوانح باور کرتا تھا جب کہ میرا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ کیوں کہ یہ متعدد مشاہیر کے تاثراتی ومشاہداتی مضامین پر مشتمل ایک حسین وقیمتی گلدستہ ہے—— تاہم وہ نہیں جو میں سمجھ رہا تھا؟۔اس کتاب میں شامل مضامین اگرچہ مختلف اہل قلم کی تاثراتی تحریروں پر مشتمل ہیں لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ مولانا سید نورالحسن صاحب مرحوم کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اجاگر کردیا گیا ہے، خود سید ضیاءالحسن صاحب کے پانچ الگ الگ عکس حیات کو پیش کرنے والے مضامین ہیں۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرتبین کے انتخاب مضامین اور ترتیب کی خوش سلیقگی نے اس کتاب کے ذریعہ ''سوانحی ضرورت'' کو پورا کردیا ہے۔

بھائی صاحب یعنی سید ضیاءالحسن صاحب مرحوم کی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر ان پر اپنے کچھ تاثرات کو پیش کرنے کو ''تلافی مافات'' کی ایک کوشش سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اسے میری غفلت کوشی سے زیادہ مرحوم کے ''اخفائے حال'' کا کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ نصف صدی سے زائد کے تعلق، اور کاغذ وقلم سے کسی نہ کسی درجہ کارشتہ ہونے کے باوجود میں بھی ان کی پوری زندگی میں یہ نہ جان سکا کہ وہ اتنا متنوع اور مفید قلمی سرمایہ اپنے قدردانوں کے لئے پیش کر چکے ہیں؟ اور بس یہی تھا ان کا وہ وصف خاص جو آج کی نمود ونمائش کی دنیا میں خال خال ہی نظر آتا ہے—— اسی کے ساتھ ان کی تواضع وبے نفسی کا یہ انداز بھی قابل دید ہے کہ انہوں نے سخت محنت وجاں فشانی سے تدوین وترتیب دی ہوئی اپنی کتابوں کے دیباچوں میں اپنے چھوٹے بھائی قمرالحسن کا بھی شکریہ ادا کیا ہے، کیوں کہ کسی کتاب کی ترتیب میں انہوں نے تعاون کیا تو کسی کی کمپوزنگ وتصحیح ان کی ''مرہون منت'' رہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی جدائی کی کسک ان کے اپنے اعزہ واقرباء سے لے کران کے حلقۂ احباب کے تقریباً سب ہی خرد وکلاں پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے زبان حال سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ع

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

اور یہ تو ہونا ہی چاہئے کیوں کہ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے اور سب سے معتبر رہبر، محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے عظمت وسربلندی حاصل کرنے کا فارمولہ بیان کرتے ہوئے صاف اور واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ من تواضع لله رفعه الله (جو اللہ کی خاطر انکساری اختیار کرے اللہ اسے سربلند کریں گے) یقیناً خوش بخت وخوش خصال رہے سید ضیاءاللہ صاحب مرحوم کہ انہوں نے نبوی فارمولہ پر عمل کرتے ہوئے سرخ روئی وسربلندی حاصل کی۔

دل میں یادِ غم بے کراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

۲۶/ ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸/ جولائی ۲۰۲۰ء کو نماز فجر کے بعد مسجد سے واپسی پر گھر کا ماحول کچھ بدلا بدلا پایا۔ معمول کے خلاف گھر کے کئی افراد کو اپنے کمرہ میں اس طرح خاموش پایا جیسے وہ کوئی اہم خبر سنانے کے لئے میرے منتظر ہوں۔ بالآخر میرے استفسار پر میرے فرزند اصغر مولوی معاویہ عبدالرحیم نے انتہائی غمگین لہجہ میں بتایا کہ کانپور سے اطلاع آئی ہے کہ مولانا اسامہ قاسمی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میرے لیے یہ خبر بالکل غیر متوقع اور اندوہناک تھی کیونکہ مجھے ان کی علالت کی کوئی خبر نہ تھی۔ خبر ایسی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ دیر تک کلمہ ترجیع کے ورد کے ساتھ ساتھ آنسو بہاتا رہا۔ پھر بوجھل اور غمگین دل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہوا جس میں مسلسل آنے والے فون سے خلل بھی پڑتا رہا۔ بہر حال حسب توفیق تلاوت اور ایصال ثواب کے بعد اپنے اور مولانا مرحوم کے متعلقین و خیر خواہوں کو اس اندوہناک حادثہ کی اطلاع دینے کے لیے ایک مختصر تحریر ٹائپ کر کے واٹس ایپ کے ذریعہ میسج کی جو حسب ذیل تھی۔

آج بعد نماز فجر میرے فرزند اصغر معاویہ عبدالرحیم سلمہ نے مولانا محمد متین الحق اسامہ قاسمی کی وفات کی اچانک اطلاع دی تو آنکھیں اشکبار اور دل

غمگین ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ تھوڑی عمر پائی مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے دین وملت کے بہت کام لئے، جوان شاء اللہ ان کے لئے ذخیرہ آخرت بنیں گے۔ ہماری جماعت اور صف علماء کے لئے وہ ایک بہت قیمتی سرمایہ تھے۔ لاک ڈاؤن کے دوران متعدد اہل خاندان واہل تعلق کی جدائی کے صدمات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن مولانا اسامہ قاسمی مرحوم کی وفات جیسا دل پر اثر نہیں ہوا۔ زخم تازہ ہے مسلسل فون آرہے ہیں اس لیے دل پر بہت اثر ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس کس سے تعزیت کی جائے؟۔ حق تعالیٰ کی ایک قیمتی امانت تھی، اس نے واپس لے لی تو کسی کا کیا زور۔ بس صورت حال کچھ یوں ہے کہ۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں جلتا رہا اور ہم ناتواں دیکھا کئے

حق تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے شایانِ رحمت اکرام کا معاملہ فرما کر ان کا شمار شہداء میں فرمائے۔ اور ان کے جملہ ورثاء و متعلقین کو صبر جمیل اور اس کا اجر جزیل مرحمت فرمائے۔ آمین۔ آخر میں یہ بھی دعا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی کی امت کو اسامہ قاسمی جیسا مخلص بیباک اور معتبر قائد عطا فرمائے وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز۔ دل ودماغ کی حالت کچھ استوار ہونے پر ان شاء اللہ ان کی شخصیت اور اپنے خصوصی تعلق پر کچھ رقم کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے اپنے ایک عزیز کی حیثیت سے بھی اور ملت کے ایک بے لوث و بے ریا خدمت گذار کی حیثیت سے بھی بڑے حقوق ہیں۔ ع

جانے والا گیا داستاں رہ گئی

فقط
عبدالعلی فاروقی لکھنؤ
۱۸/ جولائی ۲۰۲۰ء

اس تحریر اور پھر فون پر ہوتی رہنے والی گفتگو نے میرے بعض مخلص احباب کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ہر طرح میری دلجوئی میں لگ گئے۔ میرے کچھ مخلص خردوں وشاگردوں نے تو خود میری طرف سے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا اور مجھ سے باقاعدہ تعزیت کرتے ہوئے مجھے ہر طرح صبر کی تلقین کی۔ میرے ایک مزاج آشنا اور محبت کرنے والے شاگرد مولوی ابوالحسنات ندوی نے تو یہاں تک تحریر کیا کہ............

''صدر صاحب! میں نے جو دیکھا کہ آپ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ قربت اور محبت مولانا اسامہ صاحب کیلئے رکھتے تھے۔ یقیناً وہ آپ کے بہت ہی مخلص دوست ہونگے، آپ بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ کاکوری کے ایک جلسے میں آپ نے ان کی تقریر ان کے بغل میں بیٹھ کر سنی اور آپ بہت محظوظ ہو رہے تھے حالانکہ اپنی تقریر کے بعد بیٹھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اللہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آپ کو اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے. اور آپ بھی ہمارے لئے سرمایہ ہیں، اس وبا زدہ زمانے میں اپنا خاص خیال رکھئے، اللہ آپ کی عمر دراز فرمائے اور ہمیں مستفید ہونے کے مواقع عطا فرمائے۔''

اس تحریر کے جواب میں میں نے عزیز موصوف کو لکھا کہ

''بھائی یوں تو وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ بس اسی سے اندازہ کرلو میری دارالعلوم دیوبند سے فراغت ۱۹۷۰ء کی، اور ان کی ۱۹۸۹ء کی ہے۔ وہ تو عبد الولی سے بھی کئی برس چھوٹے تھے۔ مجھے تو وہ ہمیشہ ''حضرت'' سے مخاطب کرتے تھے، جو یقیناً ان کے تواضع و بے نفسی کی بات تھی۔ بات دراصل

یہ ہے کہ وہ ایک بہت ہی قیمتی، فعال اور باغیرت عالم تھے۔ احقاق حق اور ابطال باطل میں ان کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکے گی۔ صرف ۵۳ ربرس عمر پائی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے دین وملت کا اتنا کام لیا کہ ان سے دوگنی عمر پاکر بھی لوگوں کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ نہایت خلیق، متواضع، اور سرگرم عمل انسان تھے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے وہ واقعی مجھے بہت عزیز تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ.................؟

وما کان قیس هلکه هلک واحد

ولکنه بنیان قوم تهدما

اللہ تعالیٰ بال بال کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے، آمین۔''

کانپور اور لکھنؤ کے درمیان اس طرح روابط واتصال ہیں کہ بچپن سے ابھی چند برس پہلے تک سال میں اتنی مرتبہ اور اتنی نسبتوں سے کانپور جانا آنا ہوتا تھا جیسے وہ لکھنؤ کا کوئی محلّہ ہو. کانپور کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ہی وہاں کی ایک خصوصیت متعدد واہم خدمت گزار مدارس کے ساتھ ہی کثیر تعداد میں سرگرم عمل علماء کرام کی موجودگی اور ان کی مساجد سے وابستگی بنی رہی۔ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے بین الاقوامی شہرت وعزت کے حامل مدرسہ اور اس سے وابستہ علماء کی کھیپ کی موجودگی کے باوجود علماء اور عوام کے درمیان وہ جوڑ اور ربط نہیں تھا جو کانپور میں تھا، جس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کی بیشتر مرکزی اہمیت کی حامل مساجد کے امام وخطیب علماء مدارس ہی ہوا کرتے تھے جبکہ لکھنؤ میں ایسا نظام نہ ہونے کی وجہ سے علماء اور عوام کے درمیان کانپور جیسے روابط نہیں تھے۔ کانپور میں وہ مرکزی مدرسہ اب بھی قائم وموجود ہے جہاں سے

وابستہ رہ کر حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے فیوض کے دریا بہائے۔ پھر ان کے بعد مفتیٔ اعظم ہند استاذ مکرم حضرت مفتی محمود صاحب، حضرت مولانا ظفر الدین صاحب اور ان کے برادر خرد حضرت مولانا وصی الدین صاحب، پھر حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری، قاضی احمد حسن، مولانا مبین الحق قاسمی، مولانا عبدالقیوم مظاہری اور مولانا وکیل احمد قاسمی جیسے متعدد فعال واقفین علماء کرام سے تو خوب خوب ملاقاتیں ہوئیں، ان کے ساتھ دینی جلسوں میں شرکت کے ساتھ ہی نجی مجلسوں میں ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان کی گہر بار گفتگوؤں سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ پھر قانون فطرت کے مطابق اپنے اپنے حصہ کے مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بعد ایک ایک کر کے ہمارے یہ لعل و گہر زیر زمین دفن ہوتے گئے اور ان کے اخلاف میں ان جیسی صلاحیتوں و برکتوں کی حامل شخصیتوں کی کمی دن بہ دن بڑھتی گئی۔ یوں تو مرحوم مولانا اسامہ قاسمی نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوجوانی کے دور اور اپنے بڑوں کی موجودگی ہی سے مقبولیت و ہر دلعزیزی کا سفر شروع کر دیا تھا لیکن حضرت مولانا مفتی منظور احمد (جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنا جانشین و قائم مقام قاضی شہر منتخب کر لیا تھا) کی وفات کے بعد تو وہ کانپور کے عوام ہی نہیں بلکہ علماء کے بھی سرخیل ہو گئے تھے اور ان کی اچانک وفات سے اصاغر و اکابر سب ہی پر سناٹا چھا گیا ہے اور ہر ایک کی زبان پر بس ایک ہی سوال ہے کہ جامعہ محمودیہ اشرف العلوم، جمعیت علماء اتر پردیش، رابطہ مدارس دارالعلوم دیوبند، دارالقضاۃ اور حق ایجوکیشنل سوسائٹی اور ان جیسے کئی دیگر بڑے اداروں اور تنظیموں کی اپنے کاندھوں پر ذمہ داریاں اٹھا کر اپنے منتخب و فعال معاونین کے ساتھ مسلسل خدمات انجام دینے والی مولانا اسامہ قاسمی جیسی شخصیت آسانی کے ساتھ کہاں اور کیسے مل سکے گی؟ اور ان کی رحلت سے پیدا ہونے والا ایک

بڑا خلا کیونکر پر ہوگا؟

مولانا اسامہ قاسمی کے والد ماجد مولانا مبین الحق قاسمی مرحوم بھی ایک کامیاب و مقبول استاذ اور ایک متحرک منتظم ہونے کے ساتھ ہی نہایت خوش مزاج و خوش مذاق اور شگفتہ ذوق کے مالک تھے۔ جب وہ کانپور جمعیت علماء کے صدر تھے اور ان کے خصوصی معاون و معتمد مولانا انوار احمد جامعی ناظم تھے۔ اور ان دونوں حضرات کی مشہور جوڑی نے اپنے ساتھ کانپور کے متعدد متحرک و باحوصلہ افراد کو بھی جوڑ لیا تھا۔ وہ ایک دور تھا جب جمعیت علماء کی ضلعی ہی نہیں بیشتر صوبائی شاخوں سے کہیں زیادہ کانپور جمعیت علماء سرگرم عمل تھی جس میں ''جمعیۃ ہسپتال'' کے قیام اور اس کے ذریعہ انجام پانے والی خدمات کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ کانپور کے بیشتر علماء کے استاذ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کا بھی قیام کانپور ہی میں تھا جن کی ان حضرات کو سرپرستی حاصل تھی۔ جمعیۃ علماء کا صوبائی دفتر یوپی کی راجدھانی لکھنؤ ہی میں تھا اور لکھنؤ کی ضلعی یونٹ بھی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ جس آب و تاب کے ساتھ ان دنوں جمعیۃ کی کانپور یونٹ سرگرم عمل تھی اور اپنی ملی خدمات کی وجہ سے جو اعتبار و اعتماد کا مقام اسے حاصل تھا وہ لکھنؤ یونٹ کو حاصل نہ تھا. میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی کا، خود میرا اور میرے استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنوی کا کانپور اور علمائے کانپور سے مضبوط رشتہ تھا اور برابر آنا جانا لگا رہتا تھا، خصوصاً استاذ مرحوم حضرت قاری محمد صدیق صاحب لکھنوی کا تو کانپور اور اہل کانپور سے اتنا مضبوط و مستحکم رشتہ تھا کہ ہر چھوٹے بڑے دینی و اصلاحی جلسہ میں قاری صاحب کی حاضری مقامی علماء سے بھی زیادہ ضروری و لازمی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاید ہی کوئی ہفتہ خالی جاتا ہو جس میں کسی نہ کسی مناسبت سے حضرت قاری صاحب کا کانپور جانا نہ ہوتا ہو۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں مولانا اسامہ قاسمی کی تعلیم وتربیت ہوئی، پھر اس
پر مستزاد قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ان کی اپنی ذاتی صلاحیتیں و
سعادتیں؟۔

چونکہ مولانا اسامہ مرحوم کے والد ماجد حضرت مولانا مبین الحق صاحب
میرے پھوپھا مولانا رفیق القاسمی صاحب مدظلہ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ اسی
کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ مولانا مبین الحق صاحب نے دار العلوم دیوبند سے سند
فضیلت حاصل کرنے کے بعد ایک عرصہ دار المبلغین لکھنؤ کے شعبہ مناظرہ میں
ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی گذارا جہاں حضرت امام اہلسنت کی سرپرستی
میں ان کے خصوصی استاذ میرے عم محترم حضرت مولانا عبدالسلام صاحب تھے۔
میرے والد ماجد صاحب کا بھی اس وقت دار المبلغین سے بہت سرگرم رشتہ تھا،
پھر میرے گھر کی دیوار دار المبلغین سے بالکل متصل تھی۔ ان سب کے علاوہ کچھ
دوری ونزدیکی رشتہ داریاں وقرابتیں بھی تھیں۔ ان سب وجوہات سے مولانا
مبین الحق صاحب مرحوم سے میرا بہت کم سنی ہی سے بے لوث و پرخلوص رشتہ
قائم ہوگیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کانپور شہر کے مرکزی جلسہائے سیرت النبی و
سیرت صحابہ میں بحیثیت مقرر میری شرکت عنفوان شباب ہی سے ہونے لگی۔
اس کے علاوہ مولانا مرحوم کانپور میں اپنے حلقہ اثر کے متعدد جلسوں میں بھی
بحیثیت مقرر مجھے سال میں کئی کئی مرتبہ بلواتے تھے۔ عموماً ہر چھوٹے بڑے جلسہ
کی نظامت مولانا مبین الحق صاحب ہی کرتے تھے جس کا انہیں خصوصی سلیقہ
حاصل تھا۔ ان کی بھرپور اور برموقع اشعار سے مرصع نظامت مجمع میں بیداری
پیدا کر دیا کرتی تھی .... یاد ہے کہ ان دنوں ہمارے مولانا اسامہ قاسمی
مرحوم ایک کمسن خوبرو اور خوش پوش بچہ کی حیثیت سے اسٹیج پر اپنے والد ماجد کے
اغل بغل موجود رہا کرتے تھے۔ کبھی کسی جلسہ میں ان کی تلاوت بھی ہوجایا کرتی

تھی۔ بڑی محبت اپنائیت اور پرتپاک انداز میں پورے احترام کے ساتھ ملا
کرتے تھے........... اور یہ ان کی وضعداری، نیک آثاری اور ''ثمر بار شجر''
ہونے ہی کی بات ہے کہ ملنے ملانے اور گفتگو کرنے کا جو انداز انہوں نے اپنے
بڑوں سے سیکھ کر بچپن میں اپنایا تھا، اس کا پاس ولحاظ انہوں نے اس دنیائے
فانی کی آخری ملاقات تک باقی رکھا۔ **فرحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ** اب
اداس ومغموم دل کی صدا ہے کہ

تم سے ملنا خوشی کی بات سہی ☆ تم سے مل کر اداس رہتا ہوں

یہ تو ہوئی مولانا مرحوم سے ذاتی رشتوں ومحبتوں کی بات............ جہاں
تک ان کی علمی، اصلاحی وملی خدمات اور ان کی اچانک رحلت سے پہونچنے
والے نقصان کا معاملہ ہے، تو اس پر پورے ملک کے نہ صرف علماء واہل مدارس،
بلکہ دیگر حلقوں کی طرف سے بھی تادم تحریر مسلسل اظہارِ بے چینی وبیقراری کیا
جارہا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی مغفرت وبلندی درجات کے ساتھ ساتھ ان
کے نعم البدل کے طور پر ان جیسا مخلص، بے باک اور بے لوث رہنما میسر آنے
کے لئے دعائیں کی جارہی ہیں، اس کے بعد اب مزید کچھ رقم کرنے کی گنجائش
باقی نہیں رہ جاتی ہے........... اس حوالہ سے مولانا اسامہ کی ملی خدمات اور ان
کی ہردلعزیزی کے اظہار کے لئے اس واقعہ کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ
کانپور میں ایک دوسرے مکتب فکر کے قاضی شہر کو صرف اس لئے ''زیر عتاب''
ہونا پڑ گیا کہ موصوف قاضی شہر صاحب نے اپنے ایک اخباری بیان میں مولانا
اسامہ مرحوم کی تعزیت کرتے ہوئے ان کی وفات کو ملی خسارہ قرار دینے کا جرم
کیا تھا........... اس جرم کی سزا میں ان ہی کے ہم مسلک کسی مفتی صاحب نے
(جن کا نام اس سلسلہ کی آڈیو سے نہیں معلوم ہوسکا) نہ صرف قاضی صاحب کی
تکفیر کر دی بلکہ انہیں تجدید ایمان، تجدید نکاح، تجدید بیعت اور نہ جانے کن کن

چیزوں کی تجدید کا حکم صادر فرماتے ہوئے اپنی طرف سے اُنہیں قاضی کے منصب سے تا توبہ معزول کر کے اپنے ہم مسلک لوگوں کو اپنے فتویٰ پر عمل کرنے کی تلقین بھی کر دی ہے؟

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کافر و مشرک کی موت پر اظہارِ تعزیت کیا جائے، اس کے اچھے اخلاق اور اچھے کاموں کے حوالہ سے رنج و غم کا اظہار کیا جائے تو دین وایمان اور نکاح و بیعت وغیرہ پر کوئی حرف نہیں آئے گا.......... لیکن مولانا اسامہ قاسمی کی تعزیت کرتے ہوئے ان کے اخلاق کریمانہ کا ذکر اور ان کی خدمات کے حوالہ سے ان کی وفات کو ملی خسارہ قرار دے دیا جائے تو منصبِ قاضی کے ساتھ ہی ایمان، بیعت اور بیوی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

وہ کافر نگاہیں خدا کی پناہ ☆ جدھر پھر گئیں فیصلہ ہو گیا

ہم تو نہ صرف موصوف قاضی صاحب بلکہ ان پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے والے ''مفتی'' صاحب کے بیانات کو بھی مولانا اسامہ مرحوم کے لیے فال نیک قرار دیتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ یہ مولانا مرحوم کے ایمان صادق، اخلاص نیت اور جہد پیہم کی ہی سکہ گری ہے کہ ایک طرف ان کا ''مسلکی مخالف'' بھی ان کی تعریف و تحسین پر مجبور ہوا۔ دوسری طرف ان کی وفات سے ''سہمے ہوئے شکاروں'' کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا. اور وہ ''مذبوحی حرکتوں'' پر مجبور ہو گیا۔

فیاحسرتا علی العباد۔

جہاں تک مولانا اسامہ مرحوم کا معاملہ ہے تو وہ اب اپنے اس رب کے حضور پہونچ چکے جو رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ہی علام الغیوب اور دلوں کا حال جاننے والا اور نیک و بد کی جزا و سزا پر پوری قدرت رکھنے والا ہے..........

اس لیے ہم اسی کے سامنے اپنا دامن پسارے دعا گو ہیں کہ اے رب کریم آپ اپنے اس ناتواں و کمزور بندہ اسامہ قاسمی کے ساتھ اپنے شایان رحمت معاملہ

فرما کر اس کی مغفرت کاملہ فرما دے. اس کی حسنات کا بہترین صلہ عطا فرما دے اور اس کی سیآت کو محض اپنے کرم سے معاف فرما کر اپنے مقرب بندوں میں انہیں شامل کر لے۔ ان کے ورثا و پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرما اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرما۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

مولانا اسامہ مرحوم تو یہ کہتے ہوئے ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے کہ

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

میرے حفیظ بھائی جان

۸/ اگست ۲۰۲۰ء کو ہفتہ واری ''لاک ڈاؤن'' کے دو دنوں میں کا پہلا دن بیزاری اور اکتاہٹ کے ساتھ جیسے تیسے گذر چکا تھا کہ نماز مغرب سے کچھ پہلے اس اندوہناک اور غیر متوقع خبر نے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا کہ ابھی کچھ دیر ہی پہلے بارہ بنکی میں میرے خوش گفتار، خوش اطوار اور ہر دلعزیز بہنوئی الحاج محمد حفیظ اللہ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

چند برس پہلے دل کی بائی پاس سرجری کے بعد سے ان کی علالت کا کچھ نہ کچھ سلسلہ تو چل رہا تھا۔ پھر ۸۷/ برس کی عمر میں ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے بھی ان کے اندر پہلے جیسی چستی و پھرتی بھی نہیں رہی تھی، اس کے باوجود مزاج کی شگفتگی اور انداز گفتگو کی چاشنی برقرار تھی۔ نماز، روزہ اور معمولات یومیہ کو تو اپنے گھر ہی میں رہ کر کسی نہ کسی طرح انجام دے لیتے لیکن سفر سے ہمت جواب دے چکی تھی۔ ہر ٹیلی فونی گفتگو میں جلد ہی لکھنؤ آنے کا وعدہ ضرور کرتے، مگر کم وبیش دو برس کے عرصہ سے نہ وہ لکھنؤ آسکے نہ ہی میں اپنے ضعف و علالت خصوصاً گھٹنوں میں درد کی معذوری کی وجہ سے اس دوران بارہ بنکی جاسکا ——— اس طرح دونوں جانب سے شدید خواہش و چاہت کے باوجود ایک طویل عرصہ سے ہماری ملاقات بھی نہیں ہوسکی تھی۔ بس فون ہی پر کبھی مختصر اور کبھی طویل گفتگو کے ذریعہ ہم اپنی اپنی تسلی کا کچھ سامان کرلیا کرتے۔ اسی

معمول کے مطابق دو تین روز قبل ہی فون پر اچھی خاصی تفصیلی گفتگو ہوئی تھی جس میں انہوں نے ''کرونا'' کی بڑھتی ہوئی وبا اور پھر ''لاک ڈاؤن'' پر اظہار بیزاری وافسوس کرتے ہوئے مقدس ماہ رمضان، عیدالفطر، اور اب عیدالاضحیٰ کی نمازوں کے لئے مسجد کی باجماعت نماز سے محرومی پر اپنے رنج وقلق کا اظہار کرتے ہوئے رمضان کے مکمل روزوں اور عیدالاضحیٰ کی قربانی کی ادائیگی پر اظہار شکر و مسرت بھی کیا تھا۔

وہ مجھ سے عمر میں کئی برس بڑے اور مجھ سے کہیں زیادہ معذور ہوچکے تھے، اس لئے میں نے خود کئی مرتبہ بارہ بنکی جاکر ان سے ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا، اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تو انہیں اپنی بارہ بنکی پہنچنے کی تاریخ کی بھی اطلاع دے دی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ ملاقات منظور نہ تھی، میری پیٹ کی تکالیف و دیگر امراض کا عین وقت پر ایسا سلسلہ شروع ہوگیا کہ ۱۵-۲۰/ روز تک میں مسجد بھی نہیں جاسکا ——— اس لئے میرا اور میرے مرحوم بہنوئی دونوں کا انتظار بس انتظار ہی رہ گیا اور ملاقات نہ ہوسکی۔ سچ ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں، پھر بھی کم نکلے

میرے مرحوم بہنوئی صاحب نے امراض اور ان کی تکلیفیں تو بہت ہی صبر وضبط اور کسی شکوہ و شکایت کے بغیر برسوں جھیلیں، لیکن جب دم واپسیں آیا تو شدید قلبی دورہ کے نتیجہ میں کسی علاج و معالجہ کے بغیر بس ۵-۷ منٹ کے اندر اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ ع

کتنی مشکل زندگی ہے کتنی آساں ہے موت

مرحوم کے والد جناب محمد حمید اللہ صاحب مرحوم میرے والد ماجدؒ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے اور دونوں بھائیوں کے درمیان بھی خلوص و اعتماد کا بہت مضبوط رشتہ تھا۔ اس طرح وہ میرے چچازاد بھائی بھی تھے اور انہوں نے

میرے گھر میں رہ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم بھی حاصل کی تھی، اگر چہ رشتہ طے ہونے کے بعد وہ میرے گھر سے ہٹ کر لکھنؤ کے ایک محلّہ ڈالی گنج میں ایک کرایہ کے کمرہ میں چلے گئے تھے اور وہیں رہتے ہوئے انہوں نے علم معاشرت (سوشیالوجی) میں ایم -اے کیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ سنی انٹر کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ یوپی کے محکمہ صحت میں ''ہیلتھ ایجوکیشن افسر'' کے عہدہ پر ملازم ہوگئے تھے، اور اس ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ہمشیرہ صاحبہ کے ہمراہ انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔

بہت ہی ملنسار، ہنس مکھ، اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ خاندان کے ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد سے وہ جس طرح رابطہ میں رہ کر ہر خوشی وغم میں شریک رہتے اس کی مثالیں کم ہی مل پاتی ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بھی کافی وسیع تھا۔ اسی لئے ''لاک ڈاؤن'' کی پابندیوں کے باوجود ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں جتنی بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، موجودہ ماحول میں اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لکھنؤ و بارہ بنکی کے اعزہ واحباب کے ساتھ ہی ان کی تدفین کے وقت قبرستان پہنچنے اور پھر تعزیت کے لئے آنے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہی بڑی تعداد میں بارہ بنکی کے غیر مسلم انسانیت دوست حضرات بھی شامل تھے، جن میں اہم سیاسی، ادبی وسماجی حیثیت کے حامل افراد بھی تھے —— اور یہ سب کچھ ان کے حسن اخلاق، وضعداری اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے ہوا۔

ہمارے دین اسلام میں حقوق اللہ ہی کی طرح حقوق العباد کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، اور حق تعالیٰ کا یہ واضح ومبنی بر انصاف فیصلہ ہے کہ بندہ جس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا، اس کا انتقام لینے یا معاف کرنے کا اختیار بھی صاحب حق ہی کو حاصل ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''عبادات'' بندوں اور ان کے خالق کے درمیان کی چیز ہے،

جب کہ ''معاملات' بندوں کے آپسی رشتوں وتعلقات سے وابستہ چیز ہے۔ اسی لئے ''عبادات اور حقوق اللہ'' سے کہیں زیادہ پر خطر اور لائق فکر ولحاظ چیز ''معاملات کی درستگی اور حقوق العباد کی ادائیگی'' ہے۔ کیوں کہ ہمارا خالق ومالک پروردگار ارحم الراحمین اور اپنے نافرمان وکوتاہ بندوں کو معاف کرنے اور معاف کر دینے کو پسند کرنے والا ہے، جب کہ بندے نہ اتنے بے نیاز ہو سکتے ہیں نہ ہی اتنے وسیع القلب اور سخی ہو سکتے ہیں اور احکم الحاکمین کے فیصلہ کے مطابق بندے جب تک اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں اور معاملات کی کوتاہیوں واذیتوں کو خود ہی معاف نہیں کریں گے بندوں کا خالق ومالک اور احکم الحاکمین بھی معاف نہیں کرے گا اور مظلوم ومقہور بندوں کے مطالبہ پر ظالموں وقاہروں سے انہیں پورا پورا بدلہ وانتقام دلائے گا —— عموماً راقم الحروف اور اس جیسے کوتاہ فہم اور عاقبت نااندیش بندے ''معاملات وحقوق العباد'' کی درستگی وادائیگی کی طرف اس قدر توجہ نہیں کرتے جس قدر ہونا چاہئے۔ یقیناً باتوفیق اور لائق صد تحسین ہوتے ہیں وہ بندے جو عبادات ہی کی طرح معاملات، اور حقوق اللہ ہی کی طرح حقوق العباد کا بھی پاس ولحاظ رکھتے ہیں —— اپنے تجربہ ومشاہدہ کی بنیاد پر راقم الحروف یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے بہنوئی محمد حفیظ اللہ صاحب مرحوم بھی اپنی بساط کی حد تک ایسے باتوفیق ولائق ذکر بندوں میں شامل تھے۔ **و ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔**

سخاوت، غرباء پروری، مہمان نوازی، اور اپنے خاندان وکنبہ سے لے کر اپنے محلّہ اور تمام اہل تعلق کے مفلوک الحال لوگوں کی خبر گیری ودستگیری ان کا محبوب مشغلہ تھا جس کے ذریعہ وہ سکون قلب حاصل کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس طرح اچانک موت پر آنسو بہانے اور ان سے وابستہ اپنی یادوں کو بیان کرنے والوں میں کئی ایسے خواتین ومرد بھی شامل تھے جو ان کی سخاوت وخدا ترسی سے فیض یاب ہوئے تھے۔

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا انکار وہ لوگ بھی نہیں کر پاتے جو خدا کے وجود تک کا انکار کرنے کی جسارت کر لیتے ہیں؟۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنا عزیز و چہیتا کتنا ہی طویل العمر ہو جائے، خود وہ بھی اور اس کے چاہنے والے بھی عام حالات میں نہ موت پر خوش اور راضی رہتے ہیں، نہ اس فانی دنیا کی حیات مستعار کا وقفہ بڑھانے کی طلب کو چھوڑتے ہیں —— تاہم جو با توفیق بندے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت حیات میں اپنی ذات اور اپنے کنبہ کی حدود سے باہر نکل کر دوسروں کا بھی کچھ حق سمجھتے ہوئے اس کی ادائیگی کے لئے اپنے اخلاق و کردار اور حسب توفیق ایثار و قربانی کے ذریعہ قلبی سکون کا سامان فراہم کرتے ہیں، وہ صحیح معنی میں اپنے ''انسان'' ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کو خوش کرنے کے ساتھ ہی وہ بندوں کے محبوب بھی بن جایا کرتے ہیں۔ ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کسی مطالبہ و فرمائش کے بغیر لوگ ان کی خوبیوں اور ان کی ذات سے ہونے والی منفعتوں کا ذکر کر کے بے ساختہ ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اسی بات کو شاعر نے یوں کہا ہے کہ ؎

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

ہمارے مرحوم بہنوئی صاحب اپنی دلچسپ گفتگو، مہمانوں کی آمد پر خوش ہو کر ان کے سامنے بچھ بچھ جانے کے انداز، مفلوک الحال و بے سہارا لوگوں کی خاموشی کے ساتھ مدد و امداد، اور بچوں کے ساتھ کافی کافی دیر تک ''بچہ بن کر'' ان کے کھیل کود میں شریک ہو جانے جیسی بہ ظاہر چھوٹی چھوٹی اداؤں یا عادتوں کے ذریعہ ایسے ہر دل عزیز اور محبوب تھے کہ بچہ سے لے کر بوڑھا تک ہر ایک ان کی اس طرح جدائی پر مغموم و اشک فشاں ہو گیا۔

وہ نہ ادیب تھے، نہ شاعر، مگر ان کا ذوق ادیبانہ و شاعرانہ تھا۔ اردو سے

ان کا رسمی رشتہ ''مادری زبان'' کی حد تک ہی تھا۔ انہوں نے اپنی مادری زبان اردو میں نہ کوئی قابل ذکر سند حاصل کی تھی، نہ ہی ان کی سرکاری ملازمت کے کام کاج میں اردو زبان کا کوئی دخل تھا —— اس کے باوجود کچھ گھریلو ماحول اور اس سے بڑھ کر فطری ذوق کی وجہ سے وہ ''اچھے خاصے اردو والے'' معلوم ہوتے تھے۔ تعلیم سے لے کر ملازمت تک کا بیشتر حصہ اردو مخالف یا کم از کم ''اردو بیزار'' ماحول میں گذارنے کے باوجود انہیں اردو زبان اور ''اردو تہذیب'' سے ایسی گہری مناسبت تھی کہ انہوں نے ہمیشہ اردو اخبار ہی پڑھا اور اردو زبان میں لکھی گئی کتابوں کے مطالعہ سے ہی شغف رکھا۔ کبھی جب اردو ادیبوں و شاعروں کی کسی مجلس میں ہم نشین ہونے کا موقع مل جاتا تو اپنے لطیفوں اور برمحل اشعار کے ذریعہ ''خالص اردو والوں'' کو بھی اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی، خصوصاً حج کی سعادت حاصل کر لینے کے بعد سے افسانوں، ناولوں اور ادبی کتابوں کے بجائے دینی و اسلامی موضوعات کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق غالب ہو گیا تھا۔ میرے رسالہ ''البدر'' کا مطالعہ بہت ہی شوق اور پابندی کے ساتھ کرتے۔ اس میں کچھ پسند آتا تو ملاقات پر یا پھر فون ہی پر اپنی پسندیدگی و مسرت کا اظہار کرتے، اور کبھی نظام ڈاک کی خرابی کی وجہ سے رسالہ ملنے میں تاخیر ہوتی تو اس کا تقاضا کرتے۔

اسی طرح جب تک لکھنؤ میں میرے گھر آنے جانے کے قابل رہے تو واپس جاتے ہوئے اکثر میرے پاس سے اپنی منتخب دینی کتابیں مطالعہ کے لئے ضرور لے جاتے، جب لکھنؤ کی آمد و رفت کم، محدود یا بالکل ختم ہو گئی تب بھی ان کا ذوق مطالعہ برقرار رہا —— اور اکثر ایسا ہوتا کہ فون پر مجھ سے کتابیں بھیجنے کا مطالبہ کرتے، اور میں بارہ بنکی جانے والے اپنے کنبہ کے کسی فرد کے ذریعہ کتابیں بھیج کر ان کی فرمائش پوری کر دیا کرتا۔ ابھی وفات سے کم و بیش ایک ماہ قبل ہی میرے بھانجے عبدالصبور سلّمہ لکھنؤ آ رہے تھے تو ان کو بھیج کر مجھ سے کچھ

کتابیں منگوائی تھیں۔مگر بعد کی ٹیلی فونی گفتگو سے یہ علم ہوا تھا کچھ اپنی علالت ونقاہت، اور کچھ ''لاک ڈاؤن'' کے بیزار کن نفسیاتی اثر کی وجہ سے وہ بالاستیعاب ان کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکے تھے۔

ان کی اردو دوستی، علم پروری اور خرد نوازی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جن دنوں وہ میرے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے، میں بہت کم عمر اور حفظ قرآن کرنے والا ایک بچہ تھا۔اپنے مدرسہ کے باہر بلکہ اپنے حافظ جی سے چھپ چھپا کر لکھنے پڑھنے کی کچھ مشق اپنی ہمشیرہ (جو بعد میں مرحوم کے عقد نکاح میں آکر ان کی شریک حیات بنیں) کے ساتھ گھر میں بیٹھ کر کرلیا کرتا تھا، جو ان دنوں میرے مدرسہ تجوید الفرقان کی نسواں شاخ میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔اس طرح مجھے کچھ اردو لکھنا پڑھنا آ گیا تھا۔میرے مرحوم بھائی (اس وقت وہ صرف میرے چچازاد بھائی ہی تھے) نے میرے اردو لکھنے پڑھنے کے ''خارجی ذوق ودلچسپی'' کو دیکھ کر میرے والدین کی اجازت سے جامعہ اردو علی گڑھ کے مراسلاتی امتحان ''ادیب'' کا فارم بھروادیا، اور اس امتحان کی ضروری کتابیں بھی لے آئے۔یہ امتحان اچھا خاصا معیاری ہوتا تھا، جو ظاہر ہے کہ میری اس وقت کی لیاقت کے اعتبار سے میرے بس کا نہیں تھا۔کتابیں دیکھ کر میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ دیا کہ میں یہ امتحان نہیں دے سکتا ہوں۔ مگر مرحوم نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ امتحان کا فارم میں نے بھروایا ہے تو تیاری بھی میں ہی کراؤں گا ——— امتحان کئی ماہ بعد ہونا تھا، اور اس دوران وہ جی جان سے مجھے امتحان کی تیاری کرانے میں جٹ گئے۔ نثر ونظم کی کتابوں کی مشکلات تو ان کے ساتھ والد صاحب مرحوم بھی حل کرادیا کرتے تھے۔لیکن کئی کئی صفحے اردو لکھنے کی مشق نقل واملا دونوں طریقے پر مرحوم بھائی ہی کراتے تھے ——— اور پھر اس محنت وجاں فشانی کا ثمرہ یوں ظاہر ہوا کہ میں نے ''ادیب'' امتحان سیکنڈ ڈویژن کے ساتھ پاس کرلیا۔

کم عمری کے اس پہلے امتحان کی کامیابی نے مجھے جو مسرت واعتماد عطا کیا اس نے میرے اندر امتحانات دے کر کامیابی حاصل کرنے کا ایک چسکہ ڈال دیا۔پھر تو میں نے دوران طالب علمی ہی میں جامعہ اردو علی گڑھ، جامعہ دینیات اردو دیوبند، اور اتر پردیش عربی وفارسی بورڈ الہ آباد کے متعدد امتحانات میں شامل ہوکر کامیابیاں حاصل کرلیں۔اور یہی وہ چسکہ تھا کہ تعلیم سے ''رسمی فراغت'' اور باقاعدہ پیشہ تدریسی سے وابستہ ہوجانے کے بعد بھی ۱۶-۱۷ برس تک میں پرائیویٹ طور پر عصری جامعات کے امتحانات دے کر کامیابیاں حاصل کرتا رہا، اور بفضل خدا میرے پاس سندات وڈگریوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی ——— اب اسے کیوں کر فراموش کرسکتا ہوں کہ میری مدرسہ کی تعلیم سے الگ ہٹ کر پہلا امتحان دلوانے کا کام ''میرے حفیظ بھائی جان'' ہی نے کرایا تھا؟۔

قانون قدرت کے مطابق حفیظ بھائی جان بھی دنیا کی حیات مستعار کی میعاد پوری کر کے راہی ملک بقا ہوئے۔وہ ہماری اس دنیا میں شمار کئے جانے والے ''اعزازات'' میں سے کسی ایسے ''ظاہری اعزاز'' کے حامل نہ تھے کہ مبالغہ آرائی کر کے بھی ان کی وفات کو ''ملک وملت کا بڑا خسارہ'' قرار دیا جاسکے ——— تاہم وہ اپنے اہل وعیال ہی نہیں، اپنے تمام وابستگان کے لئے اپنی وضعداری وملنساری، خوش اخلاقی وخوش کرداری، اور دوسروں کو خوش کر کے خود خوش رہنے کی خصوصی ادا کی وجہ سے واقعی ایسے ''قیمتی'' تھے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ؎

دیر وحرم میں روشنی شمس وقمر سے ہو نہ ہو
مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی پسند کو کیا کہوں

حق تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ان کی مغفرت کاملہ فرمائے اور ان کے جملہ ورثاء وپسماندگان خصوصاً میری ہمشیرہ صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔(آمین)۔

مولانا محمد عرفان قاسمی

بعض لوگ دل کے نہاں خانہ میں اتنی آہستگی اور سبک خرامی کے ساتھ ڈیرہ جماتے ہیں کہ کافی کافی مدت گذر جانے کے بعد بھی ان کے وجود کا احساس نہیں ہو پاتا۔ ہم ان سے ملتے جلتے اور ہنستے بولتے ہیں لیکن اس احساس کے بغیر کہ یہ اپنے دل کے اندر سمائے ہوئے ہیں —— پھر کوئی خوشگوار یا ناخوشگوار لمحہ ایسا آتا ہے کہ جب وہ اپنے قرب کا احساس دلاتے ہیں تو ہم چونک جاتے ہیں، اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی ''نادانستہ غفلت'' پر اپنا ہی دل ملامت کرتا ہے تو کف افسوس ملنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۶؍جون ۲۰۲۰ء کی شب میں میرے بہت ہی مخلص اور قدیم شاگرد مولانا محمد اکرم قاسمی کا فون آیا۔ وہ کاکوری کے قریب موضع منڈولی میں رہتے ہیں اور ان سے فون پر برابر بات ہوتی رہتی ہے۔ یوں گاہے بہ گاہے ان سے تعلق اور رشتہ کی بنیاد پر ملاقاتیں بھی ہوا کرتی ہیں —— لیکن ۲۴؍مارچ ۲۰۲۰ء سے ملک میں شروع ہونے والے ''لاک ڈاؤن'' کے دوران ملاقات نہ ہوسکنے کی وجہ سے فون کے ذریعہ بات چیت کچھ زیادہ ہی ہوتی رہی۔ ۶؍جون کے اس فون پر علیک سلیک کی ابتدائی گفتگو کے بعد جوں ہی انہوں نے اپنے ہم سبق ساتھی اور بے تکلف دوست مولانا محمد عرفان قاسمی کے بارے میں مجھ سے پوچھا

کہ عرفان کاتب کے سلسلہ میں آپ کو کچھ پتہ چلا؟ تو میں نے چونک کر انہیں جواب دیا کہ نہیں —— اور پھر انہوں نے کچھ یوں تفصیل بیان کی کہ کل ۵؍جون کو ان کے موبائل پر ایک مسیج آیا کہ ''مولانا عرفان قاسمی'' کا آج ممبئی میں (جہاں وہ عرصہ دراز سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے تھے) انتقال ہوگیا اور ان کی وہیں تدفین بھی ہوگئی۔ مولانا محمد اکرم کے بیان کے مطابق انہیں اس میسیج پر پوری طرح یقین اس لئے نہیں آیا کہ جس نمبر سے یہ میسیج آیا تھا وہ ان کی ہمشیرہ کے نام سے محفوظ تھا۔ انہوں نے فوراً ہی پلٹ کر اسی نمبر پر فون کر کے بات کرنا چاہی تو فون ریسیو نہیں کیا گیا۔ تب انہوں نے اپنے دوسرے ہم سبق ساتھی مولانا محمد شفیع قاسمی کو کاکوری فون کر کے اس خبر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بھی بس اس میسیج کے آنے کو بتایا، اور خبر کی تصدیق کے لئے مولانا عرفان قاسمی کے بیٹے ابوسعد سلّمہٗ سے فون پر رابطہ نہ ہوسکنے کا بھی ذکر کیا۔ اتنی اطلاع ہی خبر پر یقین کر لینے کے لئے کافی تھی، تاہم ایک امید موہوم پر دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً ہی مولانا عرفان قاسمی کے بیٹے ابوسعد سلّمہٗ کو فون کیا تو انہوں نے خبر کی تصدیق کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ مولانا کے دونوں ساتھیوں کو میسیج میں نے ہی کیا تھا —— چند روزہ علالت کا کچھ حال بتاتے ہوئے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ صرف ایک ہفتہ پہلے تک وہ پوری طرح صحت مند رہتے ہوئے اپنے معمولات کو انجام دے رہے تھے، مگر جب بستر پر پڑے تو دن بہ دن مرض کی شدت اور نقاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے ہسپتال میں داخل نہیں کیا جاسکا۔ بالآخر ۵؍جون روز جمعہ کو علی الصباح وہ فانی دنیا سے کوچ کر گئے اور اسی دن ان کی تدفین بھی ہوگئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا عرفان قاسمی ایک خوش مزاج، خوش اخلاق اور وضعدار انسان تھے۔ ان کا وطن لکھنؤ کے قریب ضلع سیتاپور کا قصبہ پینتے پور تھا، لیکن ان کی عمر کا

بیشتر حصہ اپنے وطن پینتے پور سے زیادہ باہر ہی گذرا۔

۱۹۷۸ء میں دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد ایک طویل مدت تک حصول معاش کے لئے ان کا قیام لکھنؤ میں میرے مکان کے بالکل قریب رہا۔ دارالعلوم کے زمانۂ قیام میں انہوں نے اس وقت کے شعبۂ کتابت کے مایۂ ناز استاذ منشی امتیاز احمد صاحب سے با قاعدہ فن کتابت سیکھ لیا تھا، اور پھر اسی کو انہوں نے اپنے لئے ذریعہ معاش بنایا۔ مشہور صحافی جمیل مہدی مرحوم کے اخبار ''عزائم'' کے ساتھ ہی وہ پرائیویٹ طور پر بھی متعدد رسائل وکتب کی کتابت کرتے تھے۔ ان کی کتابت کا ایک امتیاز یہ تھا کہ کتابت کے ساتھ ہی ڈیزائن وطغرے بھی وہ اسی تیز رفتاری کے ساتھ بنا دیا کرتے تھے جس طرح کتابت کرتے تھے۔ عام طور پر باذوق حضرات اپنی کتابوں کے لوح کے صفحات اور ٹائٹل کے لئے ان ہی کا انتخاب کرتے تھے۔

میرے رسالہ ''البدر'' اور میری متعدد کتابوں مثلاً ''تعارف مذہب شیعہ''، ''عورت اور پردہ'' وغیرہ جیسی کئی کتابیں بھی ان ہی کی کتابت سے منظر عام پر آتی رہیں۔ پڑوسی ہونے کے ناطہ سہل الحصول ہونے کے علاوہ میرا ان سے ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ وہ میرے بھانجے عبدالمنان قاسمی مرحوم کے بھی ہم سبق ساتھی اور بے تکلف دوست تھے، جن کا قیام ان دنوں میرے مکان سے متصل اپنی والدہ کے مکان ہی میں تھا۔ اس رشتہ کی رعایت سے وہ میرے ساتھ خصوصی احترام واکرام کا معاملہ کرتے تھے۔ کاتبوں کے عام معمول کے مطابق جب وہ میرے کام میں ٹال مٹول کرکے وعدہ خلافی کرتے تو بسا اوقات میں عبدالمنان مرحوم والے خصوصی رشتہ کی رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں جھڑکیاں دے کر بگڑ بھی جاتا تھا ـــــ مگر کیا مجال کہ مسکرانے کے سوا انہوں نے کبھی ''مجھے دی ہوئی خصوصی رعایت'' واپس لے کر مجھ سے تلخ کلامی کی ہو یا میرے مسودہ واپس مانگنے پر واپس کر دیا ہو ـــــ بلکہ ہوتا تو یہ تھا کہ وہ مسکرا

مسکرا کر معذرت ہی کرتے رہتے۔ اور جلد سے جلد میرا کام پورا کرنے کا وعدہ کر کے مجھے اپنا ''عارضی غصہ'' واپس لینے پر مجبور کر دیا کرتے تھے ـــــ بھلے ہی وہ وعدہ بھی وفا نہ ہو، لیکن وہ اپنے حسن اخلاق کے ذریعہ تعلقات کو تلخی سے تو بچا ہی لیتے تھے۔ میرے والد ماجدؒ سے بھی وہ نہایت ہی احترام وعقیدت کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ عبدالمنان مرحوم سے تو ان کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی موقع ملتے ہی وہ ان کا چشمہ اتار کر واپسی کے لئے چائے پلانے کی شرط لگا دیتے، اور اکثر وہ اپنی شرط میں کامیابی بھی حاصل کر لیا کرتے تھے۔

ہم لوگوں کی محبت و رعایت میں وہ ہمارے مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری میں سال میں دو ایک مرتبہ تو پہنچ ہی جایا کرتے تھے، جہاں عبدالمنان مرحوم کے علاوہ ان کے دوسرے ساتھی اور دوست مولانا محمد شفیع قاسمی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ کتابت ایک ایسا ''دیدہ ریزی'' کا پیشہ ہے کہ اس سے وابستہ لوگ دوستوں، یاروں، اور مجلسوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتے۔ مگر مولانا عرفان قاسمی کا اس سلسلہ میں بھی جداگانہ طرز تھا۔ لکھنؤ میں ان کے دوست احباب کا وسیع حلقہ تھا جن سے ملنے ملانے کے لئے وہ باقاعدہ وقت نکال لیا کرتے۔ وہ دینی حلقوں اور مشاعروں وغیرہ میں بھی حسب ذوق شرکت کیا کرتے تھے۔ وہ عالموں میں عالم، شاعروں میں شاعر، اور دوستوں میں دوست تو بآسانی بن جاتے تھے، لیکن اس کا اندازہ نہیں کہ وہ کاتبوں میں کاتب بھی بن پاتے تھے یا نہیں ـــــ ہاں راقم الحروف نے متعدد کاتبوں کو ان پر حسد کرتے ہوئے ضرور دیکھا ہے؟

مولانا عرفان قاسمی خوش اخلاق وخوش گفتار ہونے کے ساتھ ہی خوش پوش وخوش خوراک بھی تھے۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ ان کی کافی رقم خوش پوشی اور احباب کی ضیافت میں خرچ ہو جایا کرتی تھی۔

جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی اور ان کے بڑھتے ہوئے کنبہ کی

کفالت ''لکھنؤ جیسا نازک اندام شہر'' نہیں کرسکتا تو انہوں نے عروس البلاد بمبئی کا رخ کیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ وہاں کے سب سے بڑے اردو اخبار ''انقلاب'' کے شعبۂ کتابت سے ملازمت کے رشتہ کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ بمبئی میں انہوں نے خوب خوب نام، دام، اور عزت واعزاز کمایا۔ ان کو ''خوش حالی'' میسر آئی تو اپنے بال بچوں کے ساتھ بمبئی ہی کے ہوگئے۔ اور وہاں کے علماء، شعراء، اور صحافیوں سے ان کے بہترین مراسم قائم ہوگئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ انہوں نے روزنامہ ''انقلاب'' کی ملازمت سے آزادی حاصل کرلی اور آزادانہ طور پر اپنے کاروبار میں لگ گئے —— ان سب کے باوجود انہوں نے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ سے اپنا رشتہ بنائے رکھا۔ مجھے بھی ہر خوش گوار و ناخوش گوار موقع پر فون کرنے کے ساتھ ہی یوں بھی یاد آجانے پر فون پر رابطہ کرتے اور دیر تک بات کرتے۔ سال پیچھے اپنے وطن آتے تو اپنے لکھنؤ کے احباب کے لئے دو ایک دن کا وقت ضرور نکالتے۔ ۲۰۱۴ء میں میری والدہ ماجدہ کی وفات پر کئی مرتبہ وقفہ وقفہ سے فون کرکے اپنی پرانی یادوں کے حوالہ سے میری دل جوئی اور تعزیت کا سامان کرتے رہے۔

میرے بھانجے اور اپنے رفیق درس عبدالمنان قاسمی کی طویل علالت اور پھر ان کی وفات پر تو بار بار فون کرکے اپنی تشویش اور فکرمندی کا اظہار کرتے رہے، اور اس سے میری ہمشیرہ صاحبہ کو بھی باخبر کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ ان کی علالت کے دوران ایک مرتبہ تو انہوں نے دبتے دبتے اور مجھے دل آزاری سے بچانے کے لئے لمبی تمہید کے بعد اپنی طرف سے ان کے علاج ومعالجہ کے لئے مالی تعاون کی بھی پیشکش بہت اصرار کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کی کہ آپ سب لوگ تو ماشاء اللہ وہاں موجود ہی ہیں۔ میرا بھی عبدالمنان سے بہت گہرا رشتہ ہے، میں نے ان سے خوب خوب چھین جھپٹ کر کھایا ہے —— اب میرے مالی حالات بھی اللہ کے فضل سے مستحکم ہیں، مجھے بھی اپنے

اس پیارے مخلص دوست پر کچھ خرچ کرنے کا موقع دے دیجئے۔

اگرچہ ہم لوگ ان کی اس مخلصانہ پیشکش کو قبول نہیں کرسکے تھے، لیکن اس سے ان کے خلوص ومحبت اور ہم سب لوگوں خصوصاً عبدالمنان مرحوم کے تئیں دلی احساسات وجذبات کا پتہ ضرور چلا۔

کسی دینی واصلاحی جلسہ میں شرکت کے لئے میری بمبئی حاضری کا انہیں علم ہوجاتا تو کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر مجھ سے ملاقات کے لئے ضرور پہنچتے۔ میرا جب تک محرم الحرام کے جلسوں کے لئے ہر سال بمبئی جانا ہوتا رہا تو میرے وہاں کے طویل قیام کے دوران میری قیام گاہ پٹھان باڑی، پیرولین میں کئی کئی مرتبہ ملاقات کے لئے بھی آتے اور میری تقریروں میں شرکت کرکے بہت محظوظ ہوتے۔

۱۹۹۵ء کے بعد سے میرا محرم کے ان جلسوں میں جانے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ والد ماجدؒ کے انتقال کے بعد میری ترجیحات وضروریات بدل گئیں اور طویل عرصہ کے لئے میرا اکوری ولکھنؤ چھوڑنا دشوار ہوگیا۔ اس لئے پیرولین کے ان جلسوں میں شرکت کا سلسلہ ختم ہوگیا، اگرچہ موقع بہ موقع دیگر پروگراموں میں شرکت کے لئے جانے آنے کا سلسلہ رہا۔ مگر قدیم اور اصل بمبئی کے اس اسٹیج اور وہاں منعقد ہونے والے محرم کے اصلاحی جلسوں کی ایک خصوصی وتاریخی اہمیت رہی ہے۔ ہمارے اکابر علماء کے وہاں بیانات ہوئے۔ خود میرے خاندان میں میرے جد امجد، پھر میرے والد ماجد، اور پھر میرے مسلسل دس روزہ بیانات کا سلسلہ رہا۔ اور اللہ کے فضل وکرم سے یہاں کے بیانات و تقریروں کے ذریعہ اصلاح عقائد واصلاح معاشرہ کا کام بڑے پیمانہ پر انجام پایا۔

میرا ان مجلسوں میں شرکت کے لئے ۱۵-۲۰ر برس جانا ہوتا رہا۔ پھر جب میرے وہاں جانے کا سلسلہ موقوف ہوا تو کئی برسوں تک مختلف علمائے

کرام ومقررین عظام آتے رہے ——— اور پھر ایسا ہوا کہ یہ اہم تاریخی و اصلاحی جلسے کئی برسوں تک موقوف رہے۔ اس سلسلہ میں وہاں کے احباب مجھ سے بھی رابطہ کرتے رہے مگر کئی برسوں تک وہاں کے لئے کسی مقرر کا مستقل و مناسب انتظام نہ ہوسکا ——— پھر ادھر چند برس قبل کچھ مخلص احباب کے اصرار پر میرے فرزند ثانی مفتی حارث عبدالرحیم سلّمہٗ کے بہ حیثیت مستقل مقرر وہ ذمہ داریاں انجام دینے کی بات ہوجانے کی وجہ سے ان کا ہر سال جانا ہورہا ہے اور ماشاءاللہ انہوں نے بڑی حد تک علمی وخاندانی روایات کے تسلسل کو بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے ——— گذشتہ سال کی بات ہے کہ عیدالاضحیٰ کے بعد مولانا عرفان صاحب کا فون آیا اور انہوں نے مفتی حارث سلّمہٗ کی تعریف کرتے ہوئے ان کے بارے میں کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ آپ کے بیٹے ہیں، جنہیں میں نے نہ دیکھا ہے نہ ملاقات کی ہے؟ میں نے جواب اثبات میں دیا تو انہوں نے تاکید کے ساتھ کہا کہ انشاءاللہ اس مرتبہ کی آمد پر ان سے ضرور ملاقات ہوگی۔ اور پھر میں نے دونوں کے فون نمبر بھی ان کی فرمائش پر ایک دوسرے کو دے دیئے۔ پھر چند ہفتہ کے بعد جب میرے فرزند مفتی حارث سلّمہٗ ممبئی گئے تو مولانا عرفان قاسمی مرحوم نے بہت ہی اہتمام کے ساتھ ان سے ملاقات کی، اور اپنے دیرینہ رشتوں کے حوالہ سے اپنے خصوصی روابط پر دیر تک ''ایسی محبت آمیز ومشفقانہ گفتگو کی کہ حارث سلّمہٗ بہت متاثر ہوئے۔ اور اس ملاقات کی اطلاع مجھے فون کے ذریعہ مفتی حارث اور مولانا عرفان مرحوم دونوں نے بڑی فرحت وشادمانی کے ساتھ کی۔

خلاصہ یہ کہ ایک پیکر اخلاص ومحبت، اور تواضع وایثار سے آراستہ، ہنستی مسکراتی اور سدا بہار شخصیت کا نام محمد عرفان قاسمی تھی۔ جن کی ۵/جون ۲۰۲۰ء کو اچانک اس دنیا سے رحلت ان کے اپنے کنبہ وپسماندگان ہی کی طرح ان کے احباب کو بھی بہت مغموم کرگئی، جن میں خود میں اور میرے ساتھ دیگر کئی ان کے

لکھنوی احباب بھی شامل ہیں۔ مرحوم تو مجھ سے فون پر کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ میں جلدی لکھنؤ آنے والا ہوں اور آتے ہی اپنے مرحوم دوست عبدالمنان کی تعزیت کے لئے آپ کے اور ان کی والدہ صاحبہ کے پاس .... حاضری دوں گا ——— لیکن حقیقت یہی ہے کہ ؏

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

نہ انہیں علم تھا نہ ہمیں علم تھا کہ ان کی لکھنؤ پہنچ کر ہم سب سے ملاقات کی یہ خواہش اب ایسی خواہش ہی رہے گی جو پوری نہ ہوسکے گی؟۔

حق تعالیٰ مرحوم کو اپنے قرب خاص میں جگہ مرحمت فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کی خوبیاں اپنانے کے توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

میری باجی جان

۱۵/اکتوبر ۲۰۲۰ء کی صبح بھی بس معمول کے مطابق ہی تھی —— لاک
ڈاؤن اوران لاک ڈاؤن کے طویل اور لایعنی چکر نے معمولات زندگی کو یکسر
تبدیل کردیا ہے۔ ’’کرونا‘‘ نامی بلا نے مدارس کی رونقیں چھین کر ہم مدرسہ
والوں کو معطل و کاہل بنا دیا ہے۔ اب صبح کے چھوٹے موٹے کام تیزی کے
ساتھ نمٹا کر وقت پر مدرسہ پہنچنے کی بھی کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ صبح کے ناشتہ کے
بعد بھی گھوم پھر کر اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے لیٹ بیٹھ کر بس وقت
کی اضاعت ہی ہو رہی ہے۔ اور کیفیت کچھ یہ ہے کہ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ☆ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

باجی جان (میری سب سے بڑی بہن) کی چند روز سے علالت نے
کچھ بے چینی بڑھا رکھی تھی۔ بہ ظاہر بیماری نہ کوئی نئی تھی نہ ہی تشویش ناک
—— لیکن ان کے کچھ بدلے بدلے معمولات اور کثرت کے ساتھ مختلف
انداز میں موت کے ذکر نے ایک ناقابل بیان قسم کے اضطراب میں ضرور مبتلا
کر رکھا تھا۔ ہمارے رہائشی مکانات بالکل متصل ہونے کے باوجود گھٹنوں کے
درد کی وجہ سے ان کی بالائی منزل کی رہائش گاہ تک بار بار پہنچ تو نہیں پا رہا تھا،
لیکن فون کے ذریعہ ان کی خیریت برابر دریافت کر رہا تھا۔ ۱۴/اکتوبر کو رات
گئے ان سے فون پر بات بھی ہوئی لیکن نقاہت کی وجہ سے وہ طویل گفتگو نہیں

کر سکی تھیں، البتہ مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ دعا کرو کہ نیند آجائے تو کچھ سکون
ہو جائے گا۔ ۱۵/اکتوبر کو صبح ۸/بجے کے بعد فون پر ان کی خیریت دریافت کی تو
ان کی بیٹی نے بڑی فرحت کے ساتھ بتایا کہ رات کو نیند بھی آگئی، صبح فجر کی نماز
اطمینان کے ساتھ ادا کرنے، اور طلب کر کے چائے پینے کے بعد اب لیٹی ہیں تو
آنکھ لگ گئی ہے۔ میں نے بھی مطمئن ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا، اور لیٹے لیٹے اخبار
پڑھتے ہوئے مجھے بھی جھپکی آگئی —— ابھی ۹/اور ساڑھے نو بجے کا درمیانی
وقت تھا کہ اپنے فرزند مفتی حارث سلّمہٗ کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے
ابھی اتنا بتایا ہی تھا کہ پھوپھی صاحبہ کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے کہ اتنے میں
چھوٹی بہن کے فرزند احمد میاں سلّمہٗ گھبرائے ہوئے آئے اور انہوں نے بس اتنا
ہی کہا کہ جلدی چلئے، اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی ہانپتا کانپتا زینے چڑھ کر اپنی
باجی جان کو دیکھنے پہنچا تو وہ ہماری اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اتنی پرسکون تھیں کہ مجھ
سمیت آس پاس موجود چھوٹے بڑے کسی کو بھی ان کے موت سے ہم آغوش
ہونے کا یقین اس وقت تک نہیں ہوا جب تک ڈاکٹر نے اپنے مختلف آلات
سے جانچ کر کے ان کی موت کی تصدیق نہیں کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
ع ——

کتنی مشکل زندگی ہے کتنی آساں ہے موت

باجی جان میری تو سب سے بڑی حقیقی بہن تھیں، پھر اتفاق ایسا کہ ان
کے شوہر محمد عرفان عالم صاحب مرحوم کی لکھنؤ ہی میں ملازمت ہونے، اور
ہمارے رہائشی مکانات بالکل متصل ہونے کی وجہ سے پوری عمر ساتھ بھی رہا،
اس لئے اس عمر میں کہ اب اپنی زندگی کے دن بھی گن گن کر گذارے جا رہے
ہیں۔ ان کا ساتھ چھوٹنا، اور گھر کے موجود افراد میں کسی نام لے کر پکارنے
والے بڑے سے محروم ہو جانا، فطری طور پر باعث رنج و غم بنا ہوا ہے۔ اور
کیفیت یہ ہے کہ اس سرائے فانی میں ان کی جدائی پر ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ

گذر جانے کے باوجود کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ جو ان کی یادوں اور ان کی باتوں کے ذکر سے خالی گیا ہو؟۔ میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ باجی جان کی زندگی میں مجھے ہرگز یہ احساس نہیں تھا کہ میری زندگی اور اس کے معمولات میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ ان کی جدائی کے بعد ان کی یادوں کو قلم بند کرنے کی کوشش کروں گا تو دل کی اداسی اور آنکھوں کے آنسو بار بار قلم کا راستہ روک لیں گے اور میں بے بس ہو کر قلم کاغذ لپیٹ کر رکھتا رہوں گا؟۔ کئی مرتبہ کے اس آزمائشی مرحلہ سے گذرنے کے بعد آج پھر ہمت کی تو یہ سوچ کر یک گونہ طمانیت ہوئی کہ میری باجی جان کی ہر دل عزیزی ایسی ہے کہ انہیں بوڑھے سے لے کر بچہ تک، اور اعزہ واقارب سے لے کر میل جول رکھنے والے بیرونی افراد تک، ہر ایک پیکر اخلاق ومروت اور شریک رنج وراحت قرار دینے پر مجبور سا نظر آرہا ہے ـــــ حدیث نبوی کے مطابق خلق خدا میں یہ مقبولیت اور ذکر خیر خالق کی رحمت کو بھی متوجہ کر کے بشری خطاؤں ولغزشوں سے درگذر کئے جانے کا ذریعہ بن جایا کرتا ہے۔ اور ہمارے ارحم الراحمین خالق ومالک اللہ کو غیرت آتی ہے کہ اس کے کسی گنہگار بندے یا بندی کی اس کی مخلوق تو تعریف کرے، اور وہ قادر ومقتدر، رحمان ورحیم ہو کر بھی اس کی گرفت کرے؟ ـــــ نتیجہ میں پروانۂ بخشش عطا ہونے کی امیدیں بڑھ جایا کرتی ہیں۔

باجی جان ہم سات بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں، اس لئے انہیں اپنے والدین ہی نہیں، اپنی پھوپھیوں پھوپھاؤں، داداؤں دادیوں، اور رشتہ ناطہ کے تمام بھائی بہنوں کا بھرپور پیار ملا۔ اور کم از کم آٹھ سال بعد میری پیدائش تک تو وہ ہی سب کی آنکھوں کا تارا بنی رہیں۔ بعد میں پہلی اولاد نرینہ ہونے کے ناطہ میری بھی اس میں شرکت ہوگئی تھی۔ یوں تو آج سے ساٹھ پینسٹھ برس قبل عام طور پر لڑکوں لڑکیوں کی شادیاں کم عمری ہی میں ہو جایا کرتی تھیں،

اور اگر اتفاق سے کسی لڑکی کی بیس برس کی عمر ہو جانے پر بھی شادی نہیں ہوتی تھی تو والدین واعزہ کافی فکرمند ہو جایا کرتے تھے؟۔ مگر میری باجی جان کی شادی اس دور کے سن وسال کے لحاظ سے بھی بہت کم عمری میں جب کہ وہ صرف چودہ برس کی تھیں ۱۹۵۷ء میں ایک ایسے یتیم لڑکے سے کر دی گئی تھی جو خود بھی بہت کم عمر اور دسویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ ''گڈے گڑیا کا یہ بیاہ'' غالباً ضرورت اور شرعی تقاضے کو پورا کرنے سے زیادہ جانبین کی ماؤں اور مربیوں کے ارمانوں کی دین تھا؟۔

بہر حال وہ بہت کم سنی ہی میں ماں بھی بن گئیں، اور یکے بعد دیگر پہلے ان کے دو بیٹے عبدالمنان اور عبدالحنّان دنیا میں آئے، اس کے بعد بیٹی ـــــ اللہ کی مرضی کہ باجی جان کو اپنے ان دونوں بیٹوں کے جنازے اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑے۔ پہلے دوسرے بیٹے عبدالحنان کی ۲۰۰۵ء میں جب کہ وہ جوان العمر اور شادی شدہ تھے وفات ہوئی جس نے انہیں غم کا پیکر بنا دیا۔ پھر ابھی اسی سال ۱۱رجنوری ۲۰۲۰ء کو ان کے عالم و حافظ قرآن سب سے بڑے بیٹے عبدالمنان کی کئی ماہ کی تکلیف رساں علالت کے بعد وفات نے انہیں اندر سے پوری طرح کھوکھلا کر دیا تھا۔ بڑے اور انتہائی فرماں بردار بیٹے کی وفات سے کم وبیش ڈیڑھ برس پہلے ہی وہ اپنے شوہر محمد عرفان عالم صاحب کی رفاقت سے محروم ہو کر بیوہ بھی ہو چکی تھیں ـــــ اور یہ بھی رحمان ورحیم رب ہی کا فیصلہ تھا کہ ان کے سامنے فوت ہونے والے ان کے یہ دونوں بیٹے اپنے پیچھے اپنی اولاد بھی چھوڑ کر نہیں گئے کہ میری باجی جان کے لئے اپنے عزیز بیٹوں کی جدائی کے بعد ان کی کسی نشانی (بیٹی/ بیٹے) ہی سے دل بستگی کا سامان ہو سکتا۔

بڑے اور اولین بیٹے عبدالمنان کی جدائی نے تو انہیں تصویر غم بنا دیا تھا ـــــ یوں تو عبدالمنان کی وفات سے کنبہ کے تمام چھوٹے بڑے خصوصی طور پر اس لئے متاثر رہے کہ ان کے ذریعہ ہمارے والدین سے لے کر بھائی بہنوں

تک سب ہی کو ایک نیا رشتہ ملا تھا۔ پھر ان کی برسوں چلنے والی علالت کی وجہ سے قابل رحم حالت اور بالآخر زندگی پر موت کی فتح نے ان کی یادوں کو کنبہ کے تمام افراد کے لئے ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ لیکن پہلے سے قلبی عارضہ اور شوگر کے مرض میں مبتلا ان کی ماں کی تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ ان کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ ان کی بے قراری و بے چینی کا یہ عالم تھا کہ ماں بیٹے کی جدائی کے درمیان کی دس ماہ کی مدت میں مجھے اپنی باجی سے ہونے والی کوئی ایسی ملاقات یاد نہیں جس میں انہوں نے اپنے بیٹوں خصوصاً عبدالمنان کا ذکر آہوں، سسکیوں، اور آنسوؤں کے ساتھ نہ کیا ہو —— اب جب کہ وہ ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر اپنے بیٹوں کے پاس پہنچ چکی ہیں تو ان شاء اللہ اس دنیائے فانی کی ساری بے چینیوں، بے قراریوں، اور مصائب کا صلہ انہیں اپنے رحیم و کریم رب سے ضرور ملے گا۔

باجی جان کا ذکر صرف اس لئے نہیں کہ وہ میری بڑی بہن تھیں اور ان کی جدائی کا فطری طور پر اثر ہے —— بلکہ ان کی کچھ ایسی خصوصیات تھیں جن کا احساس ان کی زندگی میں بھی ان کے متعلقین کو تھا، لیکن اس درجہ نہیں جتنا ان کی جدائی کے بعد ہو رہا ہے؟۔ باجی جان کے بارے میں یہ بات ہمارے گھروں میں مشہور تھی کہ ان سے جب بھی ملاقات ہو، خاندان یا خاندان کے متعلقین کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی نئی اطلاع ضرور ملتی تھی۔ میں اکثر ان سے کہتا کہ چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہونے کی وجہ سے اپنے گھر میں تخت کے ایک مخصوص گوشہ ہی میں ہمیشہ نظر آنے کے باوجود اطلاعات کا یہ خزانہ تمہارے پاس کہاں سے آجاتا ہے؟۔ شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش سے لے کر بیماری دکھی اور موت تک کی اطلاعات ہم لوگوں سے پہلے باجی جان کو ہو جایا کرتی تھیں، اور اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ملاقات پر یا پھر موبائل کے ذریعہ وہی ہمیں باخبر کرتی تھیں۔ کیوں کہ اپنے موبائل کے ذریعہ اعزہ واقربا اور متعلقین سے وہ ہم سب

سے زیادہ رابطہ میں رہا کرتی تھیں۔ بہت بہت دیر تک بات کرنا اور گھر کے ایک ایک فرد کی خیر و عافیت دریافت کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ والدہ مرحومہ کی تقلید میں آنے والے غرباء و مساکین کی دل جوئی اور حسب حیثیت ان کی خفیہ مدد و امداد سے بھی ان کو خصوصی دلچسپی تھی۔ پوتی پوتے، نواسی نواسے، اور گھر گھرانہ کے ایسے خرد سال بچے جن سے عموماً ہم لوگ بس تھوڑی دیر ان کے مطلب کی گفتگو کر لیا کرتے ہیں، اور اپنے کھیل کود کو چھوڑ کر نہ ان کا ہمارے پاس دل لگتا ہے، نہ ہی ان سے دیر تک باتیں کرنے کے لئے ہمارے پاس کچھ ہوتا ہے۔ ایسے بچوں کا باجی جان کے پاس بہت جی لگتا تھا، اور بسا اوقات گھنٹوں وہ ان سے ان کے ذوق کے مطابق باتیں کیا کرتی تھیں۔ خود مجھے یاد نہیں کہ میں ان کے پاس سے کبھی اٹھا ہوں اور انہوں نے مزید بیٹھنے کے لئے نہ کہا ہو؟ حالاں کہ ان کی رعایت میں عموماً میں کافی وقت فارغ کر کے ہی ان کے پاس جاتا تھا، مگر دو دو گھنٹہ کی ملاقات کے بعد بھی میں اٹھتا تو وہ یہی کہتیں کہ تم جان بوجھ کر ذرا دیر کے لئے آتے ہو —— یہ معاملہ میرے ہی ساتھ نہیں تھا، بلکہ میری بیٹیاں اور بہویں جاتیں تو ان سے بھی یہی شکوہ رہتا۔ لطف یہ کہ ان کی گفتگو اتنی رسیلی اور دلچسپ ہوتی کہ کوئی اکتا کر ان کے پاس سے نہیں ہٹتا تھا، بلکہ دیگر ضروریات کے حوالہ سے ہی اٹھنا ہوتا تھا —— کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ باجی جان اپنی بیماری یا کسی ضرورت کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے ملاقات و گفتگو کو مختصر یا ختم کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ جانے کہ ان کی شخصیت میں ایسی کیا کشش اور ان کی باتوں میں ایسی کیا حلاوت ہوتی کہ ہمارے کنبہ ہی نہیں، ہماری پھوپھیوں اور چچاؤں وغیرہ کے کنبہ کے افراد کا بھی سب سے زیادہ باجی جان ہی کے پاس دل لگتا، اور سب کا ان ہی سے سب سے زیادہ رابطہ رہتا —— یہی وجہ ہے کہ آج ہر ایک کی زبان پر بس یہی ایک بات ہے کہ اس مشینی اور مطلب پرستی و خود غرضی کے دور میں اب ایسا کون ہوگا جو ایک

ایک کی خیریت لینے اور رابطہ بنائے رکھنے کے لئے اس طرح فکرمند ہوگا۔ اور اب بس یہی کہنا پڑ رہا ہے کہ ؎

ایک ہنگامۂ محفل ہو تو اس کو رولوں
سیکڑوں باتوں کا رہ رہ کے خیال آتا ہے

سچی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں باجی جان کو بھی اپنی امتیازی حیثیت کا احساس تھا، اور وہ میرے اس طرح ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد کی خبرگیری پر روکنے ٹوکنے اور کبھی کبھار جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے پر جو کچھ کہتی تھیں اس کا خلاصہ یہی ہوتا کہ ؎

''اکیلی'' ہوں مگر آباد ''کرلیتی'' ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد میری شام تنہائی

یہ دنیا حسرتوں، تمناؤں، اور نہ ختم ہونے والی خواہشوں و چاہتوں کی آماجگاہ ہے ہی، اور باوجود اس ناقابل انکار حقیقت کا اقرار واعتراف ہونے کے کہ یہ عالم فانی ہے اور یہاں جو بھی آتا ہے واپس جانے کے لئے ہی آتا ہے، جب بھی کوئی اپنا اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا ذکر کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی ان ہونی اور غیر متوقع بات ہوگئی؟ حالانکہ انسان اور انسانیت کے سب سے بڑے خیرخواہ اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کو باکار و بامراد بنانے کا نسخہ بتاتے ہوئے تاکید کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کی لذتوں کا خاتمہ کردینے والی چیز موت کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھو گے تو بہکنے بھٹکنے، اور خالق ومخلوق دونوں کے حقوق کو تلف کرنے سے بھی محفوظ رہوگے اور عالم فانی سے عالم باقی تک ہر جگہ معزز ومکرم بن کر ہی رہوگے ——— میں اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میری باجی جان اپنی موت کا ذکر کرتے ہوئے قبر کی ہولناکی اور عذاب قبر سے حفاظت کی دعا بڑی بے قراری کے ساتھ برابر کیا کرتی تھیں۔ خصوصاً اپنی موت سے

چند دنوں پہلے سے تو جیسے وہ موت کا کچھ اس طرح کثرت کے ساتھ ذکر کررہی تھیں جیسے وہ اس کا استقبال کرنے کی منتظر ہوں۔ اور بہ قول فانی بدایونی موت کے انتظار میں متعدد بار خود کلامی کے انداز میں انہوں نے یوں بھی کہا کہ ؎

تو کہاں ہے اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

حق تعالیٰ ان کے ساتھ اپنی خصوصی رحمت کا معاملہ فرما کر ان کو اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے۔ (آمین) ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

''گل بانگ ازل'' پر ایک نظر

سب سے پہلے تو میں شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں اپنے پچاسی سالہ مخلص ومحترم بزرگ الحاج محمد احمد ادیب صاحب کا کہ جن کی خصوصی توجہ وکرم فرمائی سے یہ کتاب میرے ہاتھوں تک آئی۔

ہمارے ادیب صاحب لکھنوی سج دھج کے ایک ٹمٹماتے چراغ کی صورت ہمارے درمیان بہ فضل خدا اس صورت میں کہ جن کی خوش اخلاقی، خوش گفتاری، اور خرداں نوازی جیسی متعدد خوبیاں لائق ذکر ہیں۔لیکن ان کی اپنی مادری اور شیریں زبان اردو کے لئے بیش بہا قربانیاں، اور وضعداری، دو ایسی اہم خوبیاں ہیں جنہیں تہذیبوں کے زوال، اور قدروں کے پائمالی کے اس دور میں ادیب صاحب کی شناخت قرار دیا جا سکتا ہے۔

برسوں پہلے انہیں ''مجاہد اردو'' کا خطاب تو اس وقت ملا تھا جب یادش بخیر ''اردو محافظ دستہ'' کے بینر تلے انہوں نے اپنے چند مخلص ساتھیوں کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر، اور حکومت وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ''اردو یا موت'' کے نعرہ یا ''لوگو'' کے ساتھ ایک تاریخ ساز تحریک چھیڑ کر نہ صرف ہر قسم کے ظلم وتشدد اور قید وبند کی صعوبتیں جھیلی تھیں، بلکہ اپنی پرزور و پرشور آوازوں سے ایوان اقتدار میں زلزلہ ڈال کر حکومت واقتدار کے نشہ میں مست لوگوں کو بیدار ہونے اور جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ادیب صاحب کی بھری جوانی اور

میرے بچپن کا زمانہ تھا، اس لئے میں اس کی تفصیلات تو نہ بیان کر سکوں گا کہ اس تحریک کے نتیجہ میں اردو کو اس کے جائز وآئینی حقوق میں سے کچھ مل بھی سکے تھے یا صاحبان اقتدار نے اپنی پرفریب چالوں سے کام لے کر صرف اشک شوئی اور طفلی تسلیوں ہی سے کام چلا لیا تھا؟۔اب جب کہ ادیب صاحب کے وہ تمام سرفروش وکفن بردوش ساتھی ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں تو ادیب صاحب تقریباً تنہا ہی اردو زبان اور اردو تہذیب کو اپنے ناتواں کاندھوں پر اس طرح ڈھوئے ہوئے ہیں کہ ان کے کاندھے، ان کی کمر، اور ان کے گھٹنے بھی ان کا ساتھ دینے سے گریزاں ہیں۔مگر وہ اپنے بزرگ ومرحوم بھائی اور مربی عبدالرشید خاں قمر لکھنوی کے شعر

مشکلیں ہی مشکلیں ہیں کارواں کے سامنے
ہیچ ہیں لیکن مرے عزم جواں کے سامنے

کو اپنا شعار بنا کر پوری وضعداری کے ساتھ اس طرح سرگرم رہنا چاہتے تھے ہیں جیسے وہ ۸۵/سالہ بزرگ نہیں، ۲۵/سالہ جواں ہوں، اور ضعف وامراض کے تمام عوارض کو شکست دینے کا فیصلہ کر چکے ہوں؟۔

اللہ اسی طرح حوصلوں کی توانائی کے ساتھ ان کی عمر دراز کرے۔آمین

کتاب اور صاحب کتاب کے ذکر سے پہلے ادیب صاحب کا بے ساختہ قدرے طویل ذکر اس لئے ہو گیا کہ ''لاک ڈاؤن'' اور ''ان لاک ڈاؤن'' کے اس پرپیچ اور حوصلہ شکن دور میں ادیب صاحب ''اپنی شان امتیازی'' کے ساتھ رات کو ساڑھے دس بجے تنہا میرے مکان آئے۔اور اپنی دیرینہ وضعداری کو نباہتے ہوئے ''گل بانگ ازل'' نامی اس کتاب کا تحفہ کسی دوسرے کے ہاتھوں نہ بھیجوا کر خود اپنے ہاتھوں مجھے عطا کیا، اور اس کا ثبوت دیا کہ ع

ابھی شہر میں کچھ لوگ باقی ہیں

''گل بانگ ازل'' علامہ رشید قمرؔ لکھنوی کی نعتوں و منقبتوں کا ایک منتخب مجموعہ ہے۔ اس لئے کچھ گفتگو کا آغاز قمرؔ صاحب مرحوم کے اس قطعہ سے ہی کرنا مناسب ہے کہ ؎

شعر اور شاعری کی بات کریں
فکر اور آگہی کی بات کریں
اور بھی تو ہیں شاعران کرام
کیا قمرؔ لکھنوی کی بات کریں

قمرؔ صاحب اور ان کے کلام سے مناسبت و دلچسپی کا میرا رشتہ اتنا قدیم اور اتنا نشاط افزا ہے کہ اس کا مختصر سے مختصر بیان بھی بہت سے قارئین کو غیر ضروری اور ''طول ممل'' نظر آئے گا۔ اس لئے قمرؔ صاحب سے اپنے تعارف اور پھر ان کی شفقتوں و عنایتوں سے سرشار ہوتے رہنے کی پہل کو بیان کرنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے عم بزرگوار مولانا عبدالمومن فاروقی مرحوم کے شہرہ آفاق ہفت روزہ اخبار ''حرم'' کا دفتر ان کے رہائشی مکان کے باہری کمرہ میں تھا۔ اور یہ کمرہ یا دفتر صبح سے لے کر شام تک مقامی و بیرونی علماء، شعراء و ادباء سے بھرا رہتا تھا، اور چچا صاحب مرحوم کی ممتاز و خوش ذائقہ ''پودینہ کی کالی چائے'' کے جام پر جام چلا کرتے تھے۔ میں اس وقت ایک کم سن بچہ تھا جو چچا صاحب کی خصوصی شفقتوں کی وجہ سے ان سے بہت مانوس تھا، اور اپنی پڑھائی کے بعد فارغ وقت کا کافی حصہ چچا صاحب کے گھر اور دفتر میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گذارا کرتا تھا۔ اور اسے میری خوش بختی کہئے کہ چچا صاحب اور ان کے یہاں آنے والے احباب کی اکثر باتیں اپنی حد پرواز سے بلند ہونے کی بنا پر نہ سمجھنے کے باوجود بھی شریک مجلس ہو کر ان کی باتیں سننے میں ایک انجانا سا لطف و مزہ آیا کرتا تھا۔

چچا صاحب کے اسی ''دفتر حرم'' میں رشید قمرؔ لکھنوی صاحب سے بھی پہلی ملاقات ہوئی جو قریب قریب روز کے آنے والوں میں تھے۔ اور قمرؔ صاحب اپنی شاعری، اور چچا صاحب اپنے خصوصی مضامین ایک دوسرے کو سنا کر کافی کافی دیر تک تبادلہ خیال کیا کرتے تھے، میں نے دیکھا اور پایا کہ قمرؔ صاحب کو نہ صرف چچا صاحب بلکہ میرے اس وقت کے خاندان کے تمام چھوٹے بڑے افراد، خصوصاً جد امجد امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب سے والہانہ و عقیدت مندانہ تعلق تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب قمرؔ صاحب ''شاہ صاحب'' نہ ہو کر قمرؔ لکھنوی کی حیثیت سے صرف ایک شاعر تھے ——— اور شاعر بھی شاعر مداح رسولؐ و مداح صحابہؓ!

پھر مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیا ہوا کہ قمرؔ صاحب نے لکھنؤ چھوڑ کر کانپور کو اپنا وطن بنالیا۔ کانپور کے اپنے جن قدر دانوں اور ان سے عشق کی حد تک محبت کرنے والوں کا ذکر خود قمرؔ صاحب کی زبان سے بھی اور ان کے برادر خرد الحاج محمد احمد خاں صاحب ادیبؔ کی زبان سے بھی متعدد بار سنا وہ دو نمایاں نام اکمل ادیب اور ماجد جائسیؔ مجھے یاد رہ گئے۔ اگر چہ میری ان دونوں حضرات میں سے کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، لیکن قمرؔ صاحب سے مشترکہ رشتۂ محبت کی وجہ سے یہ دونوں نام خصوصاً اول الذکر اکمل ادیب صاحب اور ان کی ''پونم کلچرل سوسائٹی'' کے نام میرے لئے مانوس ہیں۔

یاد آتا ہے کہ اسی ''پونم کلچرل سوسائٹی'' کے زیر اہتمام کافی عرصہ پہلے قمرؔ صاحب کا منتخب کلام پاکٹ سائز کی ایک کتاب میں شائع ہوا تھا، اور وہ کتاب قمرؔ صاحب مرحوم نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دی تھی؟۔ چوں کہ اب وہ کتاب میرے پاس موجود نہیں ہے اس لئے اس کا ذکر اپنی یادداشت سے کیا ہے ——— امید ہے کہ اس سلسلہ میں میری یادداشت نے غلطی نہ کی ہوگی۔ اور اب اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام اور اکمل ادیب صاحب کی قمرؔ صاحب مرحوم سے

محبت وعقیدت کا مظہر یہ زیر نظر مجموعہ کلام قمؔر بہ عنوان ''گل بانگ ازل'' پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہو کر میرے ہاتھوں تک پہنچا ہے جو قمر صاحب کے منتخب نعتیہ ومنقبتی کلام پر مشتمل ہے —— خاص بات یہ ہے کہ یہ مختصر مجموعہ کلام بہ قامت کہتر وبہ قیمت بہتر ہونے کے باوجود قمر صاحب کے چاہنے والوں کے لئے نہایت ہی ارزاں ہے۔ کیوں کہ ان کے چہیتے شاگرد وعقیدت مند جناب اکمل ادیب صاحب نے اس کا ہدیہ............ فی سبیل اللہ رکھ کر قمر صاحب اور ان کے کلام تک رسائی کو آسان بنادیا ہے۔

میں قمر صاحب کے کلام پر کوئی تبصرہ کیا کروں میں تو بچپن ہی سے اس کا ایسا دلدادہ رہا ہوں کہ خود صاحب کلام کی زبان سے سن سن کر اور اخبار ''حرم'' میں پڑھ پڑھ کر ان کے اشعار یاد کرلیا کرتا تھا۔ اور کبھی موقع ملنے پر جب ان کے اشعار ان کو سناتا تو وہ میرے حافظہ کی تعریف کرتے ہوئے دعاؤں سے نوازتے تھے۔ انہوں نے میرے لئے ''فرمائشی نظمیں'' بھی کہیں اور ''منظوم فرمائشی نظامت'' بھی کی۔ اور جب طبیعت جوش میں آئی تو مجھ سے ناصحانہ انداز میں والد ماجد مرحوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ؎

شعور وفکر حلیم آج کی ضرورت ہے
شعارِ ضربِ کلیم آج کی ضرورت ہے

البتہ زیر نظر کتاب کے صفحہ ۶ رکی تحریر نے مجھے ضرور چونکایا، جس میں قمر صاحب کے استاذ علامہ انوؔر صابری نے قمر صاحب کو اپنی روحانی خلافت عطا کرتے ہوئے انہیں حکم دیا ہے کہ

''وہ اللہ کے بندوں کو راہ راست دکھا کر، بواسطۂ اکابر داخل سلاسلِ متبرکہ مذکورہ کریں''

میں نے قمر صاحب کو درویشانہ لباس اور کاکل دراز کے ساتھ بار بار دیکھنے کے باوجود یہ نہیں جانا تھا کہ وہ تصوف وروحانیت کے اس اعلیٰ مقام پر

فائز ہیں کہ ''پیرومرشد'' بن کر اللہ کے بندوں کو راہ راست دکھانے کا ذریعہ بن سکیں؟

اسی طرح ان کے استاذ محترم علامہ انور صابری کا نام تو ''تحریک مدح صحابہؓ'' کے حوالہ سے بچپن ہی سے کانوں میں پڑ چکا تھا، اور ان کی پہلی زیارت بھی دفتر ''حرم'' میں ہو چکی تھی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے دوران متعدد مرتبہ ان کی قیام گاہ پر حاضری دینے، اور مشاعرہ کے اندر ان کی پاٹ دار آواز میں کلام شاعر بہ زبان شاعر سننے کا موقع بھی میسر آچکا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کی صابری سلسلہ سے وابستگی کا بھی اجمالی طور پر علم تھا۔ یہ بھی علم تھا کہ وہ قمر صاحب کے ایسے استاذ ہیں جن سے قمر صاحب واقعی بہت ڈرتے تھے۔ پھر علامہ انور صابری کی اپنے اکابر خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب سے عقیدت مندانہ رشتوں کی بھی جان کاری تھی —— ان سب کے باوجود یہ علم نہ تھا کہ صابری صاحب باقاعدہ بزرگوں سے مجاز ہو کر ایک ایسے مرشد بھی ہیں جو بیعت لے کر دوسروں کو داخل سلسلہ کرتے ہیں؟۔

زیر نظر کتاب ''گل بانگ ازل'' کے ذریعہ ہونے والے یہ دونوں انکشاف میرے لئے چشم کشا بھی ہوئے اور فرحت افزا بھی —— کیوں کہ ان دونوں باکمالوں سے میرا بھی کسی نہ کسی درجہ کا رشتہ رہا ہے۔

آخر میں جناب اکمل ادیب صاحب کو اس خوبصورت و پرمغز کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ ان کی اس فیض رسانی کا سلسلہ تادیر قائم رکھے۔ (آمین)